ناول

Sitt Marie Rose

کا اردو ترجمہ

دس لاکھ پرندے

مصنفہ

ایتل عدنان

ترجمہ

تنویر انجم

ناول

دس لاکھ پرندے

مصنفہ

ایتل عدنان

ترجمہ

تنویر انجم

عکس

AKSPUBLICATIONS

کتاب	دس لاکھ پرندے
مصنفہ	ایتل عدنان
ترجمہ	تنویر انجم
سن طباعت	2020ء
تعداد	500
قیمت	300

AKSPUBLICATIONS
Ground floor Mian Chamber3 - Temple Road
Ph:042-37300584,Cell # 0304-2224000, 0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

ایتل عدنان

ایتل عدنان ۱۹۲۵ء میں بیروت، لبنان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد شامی اور والدہ یونانی تھیں۔ انہوں نے بیروت میں تعلیم حاصل کی اور پھر امریکہ میں فلسفہ پڑھا۔ وہ شاعرہ، مصورہ اور ناول نگار ہیں۔ پہلے انہوں نے فرانسیسی زبان میں شاعری کا آغاز کیا تھا، بعد میں وہ انگریزی میں بھی لکھنے لگیں۔ فی الوقت وہ پیرس، لبنان اور کیلی فورنیا میں قیام کرتی رہتی ہیں۔ ان کی حالیہ کتابوں میں ایک تجرباتی تحریر ''پیرس جب عریاں ہوتا ہے'' قابلِ ذکر ہے۔

ناول ''دس لاکھ پرندے'' پہلے فرانسیسی زبان میں ''سِت میری روز'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ انگریزی سے اس کا ترجمہ پاکستانی اردو شاعرہ تنویر انجم نے کیا ہے۔

پیش لفظ

ایتل عدنان کا ناول ''سِت میری روز'' بیروت میں خانہ جنگی کے دوران میں، میری روز کے اغوا اور قتل کی سچی داستان پر مبنی ہے۔ میری روز ایک عیسائی عورت ہے جو قبائیلی ذہنیت کے خلاف فرد کی آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے وہ نہ صرف روایتی ازدواجی زندگی کی زنجیر توڑ دیتی ہے بلکہ عظیم تر خاندانی، قبائلی، ملکی اور مذہبی شناخت کے حوالوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے، اس کے مختلف النوع نصب العین میں، جن میں قدرِ مشترک عرب دنیا کی تاریخ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی سطحوں پر عرب اتحاد کو برقرار رکھنا ہے اور اس معاملے میں اوّلین اہمیت عرب غریب الوطن فلسطینیوں کی حمایت کی ہے۔ لبنان کی خانہ جنگیوں میں، مذہب کی بنیاد پر، انسانوں کی گروہ بندی کو حقیقت تسلیم کرنے سے انکار، میری روز کی زندگی کی قربانی پر منتج ہوتا ہے۔

میری روز گروہی فیصلے کی برتری کے خلاف فرد کی بغاوت کی نمائندہ نہیں بلکہ سماجی، سیاسی اور مذہبی اداروں کے وسیلے سے قائم کردہ مرد کی برتری کے خلاف، ایک آزاد اور مضبوط عورت ہونا، اس کی شخصیت کی بنیادی جہت ہے۔ اسے ایک عورت کی حیثیت سے تمام رشتے قبول ہیں بشرطیکہ وہ اس کی ماہیئت کی نفی نہ کرتے ہوں اور اسے اس کی انفرادی سچائی کے دائرہ کشش سے باہر گھسیٹنے پر مصر نہ ہوں۔ وہ اس نظام میں جہاں اسے قابلِ استعمال اور قابلِ تبادلہ شے بنانے والی قوتیں غالب نظر آتی ہیں، اپنی اور اپنے اطراف ہر

انسان کی انسانی حیثیت کا اثبات کرنے کے لئے اپنے جسمانی وجود کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہے۔

''ست میری روز''، فلسطینیوں کی بے وطن جدوجہد پر بھی ایک تبصرہ ہے۔ ایتل عدنان کسی شک اور ابہام کے بغیر، مسلمانوں کی بدحالی و بے سرو سامانی، فلانجسٹوں کے مظالم، عرب دنیا کی واضح لاتعلقی اور مغربی ممالک کی سازشوں کی حیوانیت پر گریہ کناں ہے مگر میری روز کا المیہ محض ایک گریہ نہیں ...... یہ ایک رضا کارانہ موت ہے، اپنے ہم قبیلہ افراد کے ہاتھوں، ایک ایسے گروہ کے لئے جو اگر چہ اس کے ذاتی ماضی کا حصہ نہیں مگر اس کی حالیہ انسانیت کی اساس ہے۔

اپنے بچپن کے ساتھی اور آغازِ شباب کے اوّلین محبوب کے ساتھ جاں بخشی کے عوض سمجھوتے سے انکار اور سزائے موت کی قبولیت نہ صرف گروہ پرستی کی نفی ہے بلکہ ماضی پرستی کے خلاف بھی بغاوت ہے۔ قدم بہ قدم بدلتی ہوئی زندگی ہر لمحے نئے فیصلوں کی متقاضی ہے اور ان فیصلوں کے حق و باطل کا تجزیہ ایک وسیع تر پس منظر میں موجود انسانی دوستی کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ اس کے قاتل عرب ہوتے ہوئے بھی ابتدا ہی سے اپنی عرب شناخت سے شرمندہ و منکر ہیں۔ صلیبی جنگوں کی دیو مالا ان کے حواس پر چھائی ہے اور اس دیو مالا کو ازسرِ نو دہرانے کی خواہش میں، ان کی آمادۂ قتل بہیمانہ ماضی پرستی زندہ ہو کر، غریب الوطن فلسطینیوں کے خلاف، انھیں ان کے سارے وسائل کے ساتھ، غیر ملکی طاقتوں کا آلۂ کار بناتی ہے۔

''سِت میری روز'' کی مؤثر علامات اور اسلوب، اسے ایک منفرد اور طرزِ نو کا حامل ناول بناتے ہیں۔ پرندوں کا شکار اور میری روز کے گونگے بہرے شاگرد، اس ناول کی بنیادی علامتیں ہیں۔ میری روز کے قاتلوں کا گروہ دراصل پرندوں کے شکاریوں کا ایک جتھا ہے جن کے لئے کسی تعلق کا انبساط شکار کی لذت سے بڑھ کر نہیں۔ اس شکار کے لئے وہ

پہلے شام کے صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں اور پھر جب پرندے شام کے آسمانوں پر ناپید ہونے لگتے ہیں تو ان کے حملے کا رخ ترکی کی ''پاک دامن دوشیزہ'' کی جانب ہوتا ہے۔ واضح طور پر یہ شکار سامراجیت کی علامت ہے اور یہ شکاری مغربی سامراج کے علمبردار۔ شکار میں کتے کی جگہ فوکس ویگن کو استعمال کرتے ہوئے، جدیدیت کے یہ دلدادہ سطحیت کی اس منزل پر ہیں جہاں صرف ذاتی لذت کا حصول ہی منتہائے مقصود ہو سکتا ہے اور اسٹیریو ٹائپنگ (Stereotyping) تجزیے کی آخری حد۔ شکار، جس کا لازمی نتیجہ فطرت کی تباہی ہے، مغرب کی جدت پسندی اور سامراجیت کا، جس کا اظہار سب سے زیادہ ہتھیاروں کا بلا جواز ایجاد و استعمال میں ہوتا ہے، ایک معمولی سا مظہر ہے۔ شکاریوں کے اس جتھے کے ہاتھوں انسانوں کے قتل کی منصوبہ بندی اور ''میری روز'' کا خاتمہ ان کی اسی بنیادی جدت پرستی اور سامراج پرستی کی منطقی توسیع ہے۔

گونگے اور بہرے بچے جنھیں میری روز تعلیم دیتی ہے اور جن سے محبت کرتی ہے اور جو معاشرے کی بیرونی سرحدوں (Peripheries) پر رہتے ہوئے، مکمل طور پر حاشیوں میں زندہ ہیں، ان بے بس انسانوں کے نمائندے ہیں جن کی آواز ہتھیاروں کی مطلق العنان سختی کے سامنے ناشنیدہ رہتی ہے۔ ایتل عدنان ان کی زبان کو استعمال کرتی ہے اور ہمیں معاشرے کے اس طبقے کی آواز سناتی ہے جو سچ کو محسوس کر سکتا ہے، سچ کو پہچانتا ہے اور بالآخر سچ کو بچا نہ پانے کی شدید ناکامی کا رقص کرتے ہوئے، سکوتِ باطل کے خلاف تحریک کی امید بن جاتا ہے۔ شکاری جوان کی تربیت گاہ کو ایک نوآبادی میں بدلتے ہوئے، ایک غیر متعلق (outsider) ظالمانہ قوت اور بے جا مداخت پر مُصر سامراجیت کے نمائندے ہیں اور ان کے لیے قابلِ نفرین ہیں، اس بات سے قطعی ناواقف رہتے ہیں کہ ''میری روز'' کو غداری پر سزائے موت دے کر، وہ ان بچوں کو حب الوطنی کا سبق دینے میں کتنے ناکام ہیں اور کسی حد تک اپنے ہی خلاف ایک نئی بغاوت کا شعلہ بھڑکانے میں مصروف

ہیں۔

مصریوں کی دیوی آئسس (Isis)، عراقیوں کی اشتار، مراکش کی انات؛ بن باپ کے بچوں کو جنم دینے والی دیویاں ان عورتوں کی نمائندہ ہیں جو اپنے بیٹوں کی بے جسم مائیں ہونے کے علاوہ کچھ نہیں اور ''میری روز'' کا وجود ان کی نفی کرتا ہے۔ وہ ماں ہونے سے پہلے اور ماں ہونے کے بعد، ہر حال میں انسانیت کے درجے پر سرفراز ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لئے بھی جھوٹ کا سہارا لے کر، اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی۔ وہ ایسے خاندان کی سربراہ ہے جس میں ماں اور بیٹے کے درمیان ایڈیپس کمپلیکس (Oedipus Complex) کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے، احساسِ ملکیت کی شدت سے پیدا ہونے والی تنگ نظری اور بربریت کا سبق نہیں پڑھاتی۔ وہ سچ کے لئے نہ کسی رشتے کی پابند ہے نہ ہی کسی رشتے کے لئے زندہ رہنے کی پابند ہے۔

''ستِ میری روز'' صرف خانہ جنگی سے تباہ حال بیروت کی داستان ہی نہیں بلکہ ہر اس شہر کی کہانی ہے جو گروہ پرستی سے مجروح ہے اور میری روز اس گروہ پرستی کے خلاف جدوجہد کرتی روحِ انسانیت کا استعارہ ہے۔ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال میں شناخت کے مختلف حوالوں کی بنیاد پر، گروہ بندی اسی بربریت اور جارحیت کی طرف مائل ہے جس نے بیروت میں آخر کار خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی تھی اور زبان، ثقافت، دولت، مذہب اور ایسے ہی دیگر حوالوں سے گروہ پرستی کی اس یلغار کو روکا نہ گیا تو وہ دن غالباً دور نہیں ہوگا جب ہم بھی خانہ جنگی کی منزل کو پہنچ جائیں گے۔ ''ستِ میری روز'' کی اشاعت اسی تعصب و بربریت کے خلاف جدوجہد کی راہ میں اٹھایا ہوا ایک قدم ہے۔

''ستِ میری روز'' صرف ایک سیاسی پیغام ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پائے کا ناول بھی ہے۔ مغربی ادب میں تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کے ادب میں بھی پھیلنے والی مارکسزم، فیمینزم کی تحریکِ نو کے زیرِ اثر لکھا جانے والا یہ ناول خالص پروپیگنڈا ادب کے ضمن میں

شامل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے ادبی لطافتوں سے محروم قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقصدیت اور ادبی لطافت کا ملاپ ہی ہے جس نے اس ناول کو متعدد ملکوں میں مقبول بنایا۔

۱۹۷۸ء میں فرانسیسی زبان میں پہلی بار شائع ہونے کے بعد، کئی زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں اس کے ترجمے کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ایتل عدنان کی دیگر تحریریں جن میں شاعری کی آٹھ کتابیں بھی شامل ہیں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شائع ہوئیں۔

تنویر انجم

پہلا زمانہ

دس لاکھ پرندے

منیر کا فون آیا ہے۔ وہ ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کا منظر نامہ میں لکھوں۔ وہ چاہتا ہے کہ فلم کسی نوجوان شامی مزدور کے متعلق ہو جسے وہ اور اس کے دوست شکار کی مہم کے دوران میں لبنان آنے پر آمادہ کر لیں گے۔

پچھلی رات منیر نے ایک آٹھ رنگوں کی شاندار فلم دکھائی جو اس نے شام کے صحراؤں اور جنوب مشرقی ترکی میں تیار کی تھی۔

فلم اسکرین پر نمودار ہوتی ہے۔ گرد و غبار اور فضا کی وسعتیں میرے سامنے ہیں۔ چکراتے ہوئے بگولوں کا سارنگ اور آگ جیسی سرخ لکیروں سے مرصع آسمان نظر آتا ہے۔ پھر فوکس ویگن جیپ آتی ہے جسے پیئغ چلا رہا ہے جبکہ منیر، ٹونی اور فواد اندر بیٹھے ہیں۔ اس منظر میں شکاری بندوقیں نمایاں ہیں۔

پھر ہم پرندوں کے مانند آسمان میں پرواز کرتے ہوئے ہوائی جہازوں کا منظر دیکھتے ہیں۔ ۱۹۴۴ء کے خبر ناموں یا جنگی فلموں سے لئے گئے مناظر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خطہ لیبیا کا سا لگتا ہے اور شکاری افریقہ کور کے دھوپ سے جھلسے سپاہیوں سے مماثل ہیں۔

پھر کچھ خوبصورت مناظر ـــــــ ایک دلدل جس میں سے جیپ چھپاکے مارتی ہوئی گزرتی ہے۔ مٹی کا مٹیالا رنگ خوبصورت نظر آتا ہے۔ پرندے واپس آتے ہیں مگر اب

تاریکی بڑھ گئی ہے۔ غروبِ آفتاب اپنے شدید رنگوں میں شاندار دکھائی پڑتا ہے۔ شکاری میزائل پھینکنے والوں کی طرح رائفلوں سے آسمان کی سمت نشانہ باندھتے ہیں۔ ان کے لبوں پر ہنسی ہے جوان کے دانتوں، ان کے جوش اور ان کی مسرت کی نمائش کر رہی ہے۔

منیر بہ آوازِ بلند تبصرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی بیوی، دو بھابھیاں اور ان کی ایک دوست فرش پر بیٹھی ہیں۔ اس کا مکان بیروت کے خوبصورت ترین مکانوں میں سے ایک ہے جہاں اسے یہ خواتین ناظرین میسر ہیں۔ یہاں موجود لڑکیوں میں ایک ٹونی کی کزن ہے۔ اس تمام گہما گہمی کی طرف اس کا رویہ قدرے نفرت کا سا ہے کیونکہ مردوں نے اسے اپنے ہمراہ ترکی لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ خواہ مخواہ مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

اسکرین پر، ایک پنک فلائیڈ کا گیت سنائی دیتا ہے۔ یہ بلا تسلسل موسیقی ہے اور اس کے سُروں کے ساتھ پرندے گرتے ہیں۔ اس منظر کی ہم آہنگی لاجواب ہے۔ ٹونی گولی چلاتا ہے، ایک پرندہ گرتا ہے۔ پیئغ گولی چلاتا ہے، ایک پرندہ گرتا ہے۔ منیر گولی چلاتا ہے، ایک پرندہ گرتا ہے۔ فواد گولی چلاتا ہے، ایک پرندہ گرتا ہے۔ ان سب کے چہرے دمکنے لگتے ہیں سوائے فواد کے۔ فواد ایک مکمل قاتل ہے۔ اسے ہمیشہ کافی قتل نہ کر پانے کی تکلیف رہتی ہے۔ پرندے کے نرم جسم سے ٹکرا کے گولی ڈوب سی جاتی ہے۔ اس ٹکراؤ میں ایک وہ سخت اور خشک قسم کا لمس نہیں ہے جو فواد کو مطمئن کر سکے۔

فواد یوں شکار کرتا ہے جیسے اسے کوئی خبط ہو۔ قتل کو بوسے پر ترجیح دینا اس کے لئے فطری بات ہے۔ اسے ''میک لو'' کے لفظ سے نفرت ہے کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق ،آپ کچھ نہیں بناتے۔ وہ جیپ، تیز رفتاری، صحرا، پرندے اور گولی کو لڑکی، بستر اور محبت پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے اجتماعی جنس بھی بور کرتی ہے کیونکہ اس کے نزدیک لوگوں کے ایک گروہ کے ساتھ بند ہو جانے اور حشیش کے ذریعے بلندی پر پرواز کرنے میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ اسے آزادانہ جنسی میل جول سے کراہت آتی ہے۔

منیر، ٹونی اور پیئغ ہر کام تھوڑا تھوڑا کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ سرسری انداز میں دل بہلانے کے لئے کام کرتے ہیں۔ منیر کا خاندان انتہائی دولت مند ہے اور وہ ٹونی اور پیئغ کو اپنے منصوبوں اور کاوشوں میں شریک رکھتا ہے۔ فواد بھی اس گروہ کا ایک حصہ ہے، مگر ان تینوں میں سے کسی کو ایک عورت سے بھی وہ لذت حاصل نہیں ہوتی جو فواد کو ایک کار سے حاصل ہو جاتی ہے۔ کاروں کی ریس جسمانی تعلق کی ایک رات سے افضل ہے اور شکار اس سے بھی بہتر! کھیلوں کی دنیا میں بھی ایک درجہ بندی ہے اور ہر لحاظ سے شکار افضل ترین مشغلہ ہی رہتا ہے۔ یہ زیادہ صحت بخش ہے اور زیادہ دانش ورانہ بھی ہے۔ ایک شخص لبنان سے نکلتا ہے اور ایک ہمسایہ (اور دشمن) ملک شام سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ شامی زیادہ دولت مند اور زیادہ ساز و سامان سے لیس نہیں ہیں۔ ان کے طریقۂ شکار میں حسن کا بھی فقدان ہے۔ پہلے یورپی لوگ ہوتے تھے جو شکار کی غرض سے، شام، عراق اور دیگر علاقوں میں جاتے تھے۔ (ایسے چہروں والے جیسے کہ ہم نے اسکرین پر دیکھے۔) اب ان کی جگہ عیسائی ہیں۔ نئے زمانے کے لبنانی جو اپنے نیم سیاحتی، نیم فوجی لباس میں جہاں چاہتے ہیں، جاتے ہیں۔ وہ اپنے کیمرے اپنے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ ان سے فلمیں بنا سکیں، اپنے کارناموں کی، اپنی پٹیوں، اپنے جوتوں، نیکروں، بٹنوں اور زپوں کی، اپنے چاک گریبانوں اور ان سے جھانکتے کالے بالوں کی فلمیں۔ یہ چاروں افراد نہایت با اصول ہیں۔ یہ کبھی اکٹھے نہیں سوتے۔

فلم کا اختتام کار کی تصویر پر ہوتا ہے جس میں مردہ پرندوں کے ڈھلکے، چھلنی بدن پروں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ شکار میں فوکس ویگن نے کتے کی جگہ لے لی ہے اور اس کے تمام کام انجام دیتی ہے۔

منیر انکسار کے ساتھ وضاحت کرتا ہے کہ فلم میں کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ سب اسے یقین دلاتے ہیں کہ وہ اسی طرح بالکل ٹھیک ہے۔ یہ فلم بہرحال ایک چھوٹا سا شاہکار ہے۔

قطاروں میں پرواز کرتے ہوئے پرندے۔ فطرت میں بھی کیسی سچائی ہوتی ہے۔ فلم کا ہر منظر ایک دوسرے سے مربوط ہے۔

''آپ لوگوں نے کچھ نہیں دیکھا، واقعی۔'' منیر کہتا ہے۔ ''میں آپ کو بتا نہیں سکتا صحرا کا حسن کیا ہے۔ آپ کو اسے دیکھنا چاہیے۔ صرف آپ خواتین، آپ اسے کبھی نہیں دیکھیں گی۔ آپ کو اپنے بھروسے پر نکلنا چاہیے۔ ایک نقشے اور قطب نما کے علاوہ کسی مدد کے بغیر، صحرا کی حقیقت کے ادراک کے لئے آپ کو اپنا راستہ خود ڈھونڈنا چاہیے۔ آپ! آپ لوگ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گی۔''

یہ سچ ہے۔ ''ہم عورتیں'' اس چھوٹے خامیوں سے بھرے رنگین سنیما ہی سے خوش تھیں جو بیس منٹ کے لئے ان مردوں کو، جنہیں ہم روز دیکھتے ہیں، ایک اضافی قدر و منزلت بخش رہا تھا۔ اس محدود حلقے میں ایک جادو جو اِن مردوں کا جگایا ہوا ہے، ایک بار پھر طاری ہو جاتا ہے۔ ہم سب اس سوانگ میں شریک ہیں۔

''اگلی مرتبہ تم ہمیں ساتھ لے جانا۔'' ہم میں سے کوئی عورت بغیر اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہتی ہے۔ اس کو جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کی جاتی۔

کچھ دنوں کے بعد منیر مجھے فون کرتا ہے: ''تمھیں معلوم ہے میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ مجھے تم سے ملنا ہے۔ میں تمھارے ساتھ ایک فلم بنانا چاہتا ہوں لیکن یہ میری فلم ہوگی۔ بس میں اسے تمھارے ساتھ بنانا چاہتا ہوں۔''

منیر کی بیوی کے وسیع و عریض گھر کے ایک کمرے میں، فلم کے بارے میں، ہم نے اپنی پہلی ملاقات کی۔

''میں تمھیں پہلے ہی بتا دوں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ تمھیں معلوم ہے سنیما سے مجھے کتنی دلچسپی ہے لیکن اپنے تمام کاروباری معاملات چھوڑ کر، میں اپنے آپ کو سنیما کے لئے مکمل طور پر وقف نہیں کر سکتا۔ پھر بھی ایک کمرشل فلم بنانا چاہتا ہوں۔ ایک سچی فلم، چاہے اس میں دس

سال لگ جائیں۔ دراصل میں خود پر ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں یہ کام کرسکتا ہوں۔''

''پھر میری کچھ ذاتی ترجیحات بھی ہیں۔ تمھیں معلوم ہے میں شام سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں شام سے واقف ہوں۔ میں اس کے تمام دُور دراز کے علاقوں میں جاتا ہوں۔ ہر جگہ ہی گیا ہوں میں۔ شام کا کوئی گاؤں لے لو______ اس سے مجھے یہ بھی خیال آیا ہے کہ مجھے تم کو وہاں لے کر چلنا چاہیے۔''

''میں شام کے دیہات کے بارے میں جانتی ہوں، میں نے بچپن میں گرمیاں اکثر وہاں گزاری ہیں۔''

''شاہراہوں سے دُور ایک گاؤں، شکر کے ڈھیروں جیسی چھتوں والے گھروں کا ایک گاؤں۔ ہر چیز مٹی کی بنی ہوئی۔ ہر چیز پر سورج کا سنہری رنگ۔ لوگ وہاں بالکل سادہ ہیں۔ بڑے مہمان نواز...... ابھی وہ خراب نہیں ہوئے۔''

''کیا! کیا ان کے پاس ریڈیو نہیں ہیں؟''

''ہیں، لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو ہم پہلے یورپی تھے جو انہوں نے دیکھے۔ معاف کرنا، میرا مطلب ہے پہلے لبنانی۔''

''میں سمجھتی ہوں۔ تمھارا مطلب ہے پہلے موڈرن لوگ۔''

''بالکل ٹھیک۔ تم جانتی ہو پہلے یورپی ہوا کرتے تھے اور اب ہم ہیں جو ہر اس شے کی نمائندگی کرتے ہیں جو جدید ہے۔ انھوں نے ہمارے سامان کو دیکھا...... ہماری رائفلوں کو۔''

''تمھارا مطلب ہے، تمھاری مشین گنوں کو...... ٹھیک؟''

''ٹھیک! ہماری بندوقوں کی طاقت ان کے لیے ناقابلِ تصور تھی۔''

''کیا تم نے بہت پرندے مارے؟''

''نہیں۔ وہاں لبنان کے مقابلے میں زیادہ پرندے ہیں مگر تم اس بات سے اتفاق

کروگی کہ شام میں اب جنگلی جانور ختم ہو رہے ہیں۔ ہمارا اگلا دورہ ترکی کا ہوگا۔ وہ ابھی تک شکاریوں کے لئے ایک پاک دامن دوشیزہ ہے۔ وہاں وہ سب کچھ ہے جس کی آرزو کی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو ہم گاؤں میں پہنچے۔ اس کے بعد فلم کے لئے تم کیا کرو گے؟"

"نہیں، پہلے اس بات کو صحیح طرح سمجھو۔ شامی ہمیں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ ہمیں پسند کرتے ہیں۔ میں ان سے دوستی کرتا ہوں اور پھر میں بار بار اس شامی گاؤں میں جاتا ہوں۔ ہر دفعہ وہ ہمیں پہچان لیتے ہیں اور ہر دفعہ وہ بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر پہلے جیسے نہیں رہتے۔"

"اور پھر؟"

"میں ان میں سے ایک دو کو بیروت لانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں انھیں یہاں آنے کی دعوت دوں۔"

"تم انھیں لے کر آؤ گے یا وہ خود آئیں گے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایک نوجوان شامی بیروت میں...... یہ ایسا ہے جیسے ہم پیرس میں۔"

"تمھارا مطلب ہے ایک دیہات سے آیا ہوا شامی؟"

"بے شک۔"

"اب بات کچھ واضح ہوئی۔ تم ان فلموں کی طرح فلم بنانا چاہتے ہو جن میں الجیریا کے مزدوروں کو پیرس میں دکھایا جاتا ہے۔"

"بالکل درست! لیکن ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ پہلے صحرا کا حسن ہے جسے میں پردۂ سیمیں پر لانا چاہتا ہوں۔ تم نہیں جانتیں وہ کیا غضب کی چیز ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ایک زیادہ آرٹ فلم نہیں چلے گی۔"

''آرٹ فلم؟ نہیں۔ مگر میرے لئے چونکہ پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے اس لئے اگر میں اس فلم کو بناؤں گا تو شکاریوں کے نقطۂ نظر ہی سے بناؤں گا۔ انھیں اپنی برتری پر فخر ہے۔ مگر وہ اس گاؤں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ یہ اتنا دلنشین ہے اور اس قدر معصوم۔''

''جو بات میرے لئے دلچسپی کا باعث ہے وہ بیروت میں ایک شامی مزدور کی زندگی ہے۔''

''بے شک ___ اور وہ صرف ایک نہیں ہوگا بلکہ دو یا تین ہوں گے۔ اس طرح ہر ایک کی اپنی کہانی ہوگی۔''

''اس صورت میں تم میرے لئے دو یا تین زیرِ تعمیر مقامات تلاش کرو، جہاں تم ٹھیکیدار کو جانتے ہو اور جہاں جا کر، میں شامی مزدوروں کی زندگی سے واقفیت حاصل کر سکوں۔ یہاں آس پاس کوئی دو ہزار ایسی جگہیں ہوں گی۔''

''لیکن وہ لوگ پہلے ہی بیروت کی زندگی کو اپنا چکے ہیں۔ انھیں اب کوئی بات حیران نہیں کرتی۔''

''ابھی اس بات کی تصدیق کرنا ہوگی کہ انہیں کوئی بات حیران نہیں کرتی۔ بہر حال میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ مجھے ان کی اصلیت کے بارے میں معلومات کی ضرورت ہے۔ ان کے خاص مسائل کے بارے میں۔ اس فضا......''

''نہیں، نہیں۔ تم نہیں سمجھ رہیں۔ تم اسکرپٹ لکھوگی۔ میں فلم بناؤں گا۔''

''میں اسکرپٹ بغیر کچھ جانے نہیں لکھ سکتی۔''

''فی الحال میں تم کو شام لے چلوں گا......

لیکن جو کچھ یہاں ہوتا ہے وہ اصل میں اہم ہے۔''

''یہ تمہارا نقطۂ نظر ہے، میرا نہیں۔''

''اس فلم کو کچھ کہنا چاہیے۔ ان لوگوں کے مسائل، ان کی زندگیوں کے بارے میں

کہنے کے لئے بہت سی اہم باتیں ہیں۔"

"یہ مجھے کرنے دو۔ میں نے اپنے دوست جین پئیغ کو پیرس سے بلانے کے بارے میں سوچا ہے۔ وہ لبنان سے واقف ہے اور فلمیں بناتا ہے۔"

"یہیں بیروت میں کوئی ڈائریکٹر ڈھونڈ لو، ان نوجوانوں میں سے کوئی، جو ابھی غیر ممالک سے واپس آئے ہیں۔"

"وہ یا تو میرا خیال چرا لیں گے یا پھر اسے اپنے طریقے سے بنانا چاہیں گے۔ میں کوئی ایسا شخص چاہتا ہوں جو میری مدد کرے، وہ سب کرنے میں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تضاد......"

"ایسی صورت میں اپنے دوست کو بلانے کا انتظام کرو۔"

جین پئیغ نے کچھ ویڈیو بنائے ہیں اور فوٹوگرافی کی ہے۔ وہ منیر کے اعصابی تناؤ سے کچھ پریشان سا ہے۔ اسے میری رائے سے اتفاق ہے کہ صحرا کا سرخ آسمان ایک فیچر فلم جتنی طویل فلم کے لئے کوئی مناسب موضوع نہیں ہوگا، خاص طور پر جب منیر تہواروں پر اور کمرشل تھیٹروں میں اس کی نمائش کرنا چاہتا ہے۔ وہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ہم دو شامی مزدوروں کی کہانی پیش کریں جو پہلے سے بیروت میں رہتے اور کام کرتے ہوں۔ فلم کے اختتام پر ایک مزدور حمرا اسٹریٹ کی رنگینیوں میں (جن میں پن بال مشین کھیل بھی شامل ہے) بہ آسانی شامل ہو جائے جبکہ دوسرے کا انجام المیہ ہو۔" وہ اپنے فورمین کو قتل کر دیتا ہے......" میں کہتی ہوں۔ جین پئیغ اچھل پڑتا ہے۔ منیر ناراض ہو جاتا ہے۔

"تم لوگ ابھی سے کہانی کے انجام تک جا پہنچے جبکہ میں دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ شام کے دیہاتوں میں کتنے مطمئن ہیں۔ کتنی دانائی ہے ان میں! فطرت سے کتنے ہم آہنگ ہیں وہ!"

''شام کا موسم بہت شاندار ہوتا ہے، میں جانتا ہوں۔'' جین پنگ کہتا ہے۔
''سنو منیر! اپنے خیال کی وضاحت کرو اور ہم اس پر کام کرنے کی کوشش کریں گے۔
اس دوران میں، مَیں ایسے علاقے کا چکر لگاتی ہوں جہاں عمارتیں بن رہی ہیں۔ میں ہمیشہ ایسے کسی مقام کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اب میرے پاس ایک بہانہ ہوگا۔''

اس شہر میں جو عصمت فروشی کا مرکز ہے، بہت دولت ہے اور متعدد تعمیری منصوبے جو کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچیں گے، وہاں سیمنٹ زمین کے ساتھ گھل مل گیا ہے اور رفتہ رفتہ زیادہ تر درختوں کا خاتمہ کر چکا ہے۔ کھڑکی سے یہ مقام جسے ہم شہر کہتے ہیں، دھوپ میں بدرنگ ہو جانے والے ٹکروں کی ایک عظیم بساط نظر آتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کوہِ سینا سے آتی ہوئی روشنی کس طرح اس منظر کو تبدیل کر دیتی ہے، آپ کو بہت سویرے اٹھنا پڑے گا، طلوعِ آفتاب سے بھی پہلے۔ اس وقت ان زرد نیم شفاف رنگوں کے اجسام کے درمیان کوئی شے، کوئی درخت یا خالی زمین ان کے تناسب کو بگاڑنے کے لئے نہیں آتی۔ ان اجسام سے عمارتوں کی اینٹوں کا مہیب ڈھیر بنتا ہے، جس کو دیکھ کر، مجھ میں ایک درویشانہ دہشت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کیفیت کی طرح ہے جو ٹاؤس کے ایک انڈین گاؤں میں ایک صبح مجھ پر طاری ہوئی تھی۔

لیکن ایک گھنٹے کے بعد ایک کمینگی بھرا بھوراپن سا اس نیم کاروباری، نیم صنعتی شہر پر اترتا ہے اور تضادات نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسے آرام دہ مکانات کے برابر میں جھونپڑے کی منزلوں میں اضافہ ہوتا ہے اور کنکریٹ کے پنجر صبر سے ایک دوسرے کے سروں پر چڑھے کھڑے رہتے ہیں۔

اس سڑک پر جہاں میں رہتی ہوں، کئی بڑی عمارتیں زیرِ تعمیر ہیں جنھیں مکمل ہونے میں دو سال لگیں گے۔ یہ بڑی حد تک شہر کا عیسائی علاقہ ہے جس میں ابھی تک ایک مفلس اقلیتی جبلت زندہ ہے جو پرانے مشرقِ وسطیٰ کی خصوصیت تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیروت شمال سے جنوب کو جاتی ہوئی ایک لکیر سے تقسیم ہوا ہے جس میں بیشتر مسلم علاقے مغرب میں اور عیسائی علاقے مشرق میں ہیں۔ جبکہ کہیں کہیں اور خاص طور پر ساحل کے ساتھ والا حصہ، ایک طرح کا سیاحت اور عصمت فروشی کا آزاد علاقہ ہے۔

زیرِ تعمیر مقامات پر منیر نے مجھے شامی مزدوروں سے بات چیت کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ زیادہ تر نوجوان، سادہ، غیر تربیت یافتہ مزدور ہیں، خاص موسموں میں آنے والے۔ جیسا کہ ہر ملک میں ہوتا ہے، دوسرے ملکوں سے مزدور آتے ہیں۔ میزبان ملک کے نقطۂ نظر سے ان کی محنت ارزاں ہوتی ہے مگر غریب الوطن مزدوروں کے لئے بھی یہ بڑی اجرتیں ہیں۔ کنٹریکٹر خوفناک سا ہے۔ وہ مزدوروں کو کمتر درجے کی مخلوق سمجھ کر بات کرتا ہے۔ بوجھ اٹھانے والے جانوروں کی طرح جو دو ٹانگوں پر صرف اس لئے چلتے ہیں کہ سیڑھیوں کی تنگی کے سبب چار ٹانگوں پر چلنا ناممکن ہے۔ وہ سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے شاندار اور بہت بڑی کاروں میں آتا ہے جو اپنے اگلے حصے کی وجہ سے بے ہودہ لگتی ہیں۔ بیوکس، شیورلیٹس۔ مزدور، چھوٹے، گٹھے ہوئے، مضبوط عضلات والے، شرمیلے اور کم آمیز ہیں اور سب سے بڑھ کر خاموش طبع ہیں۔

میں انھیں گفتگو پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جو کچھ ہوتا ہے سب ٹھیک ہوتا ہے۔ نصف النہار کے وقت وہ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ گندگی میں بھی، جیسا کہ وہ اپنے گاؤں میں کرتے تھے۔ تھوڑا سا سیمنٹ ان کے کھانے میں مل جاتا ہے۔ رات کو وہ اس منزل پر سو جاتے ہیں جہاں کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ان مقامات پر رفعِ حاجت کے لئے کوئی جگہ کبھی نہیں ہوتی لہٰذا سب کچھ زمین پر ہی

انجام پاتا ہے۔ چنانچہ یہ مقامات کبھی ان کی بو سے پاک نہیں ہوتے۔ جب بارش ہوتی ہے تب بھی سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے۔ وہ اپنی جگہوں پر ہوا اور نمی میں رہتے ہیں اور اس کے ختم ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ جب کوئی لفٹ نصب کی جاتی ہے تو اسے تالا لگا کر رکھا جاتا ہے۔ صرف کنٹریکٹر، مالک اور گاہکوں کے پاس چابیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی پتھر کو دس منزل اوپر اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سیڑھیاں چڑھ کر پیدل ہی پہنچایا جاتا ہے۔ یہ بات طے ہے۔

میں ان سے ان کے گاؤں کی باتیں کرتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں: ''وہ دور، ادھر ہے، بہت دور۔ بیروت بہت اچھا ہے۔'' ان کا اس شہر میں پہلا ردعمل کیا تھا؟ خدا اس کی حفاظت کرے، وہ جواب دیتے ہیں۔ کیا ان کے گھر والے انھیں یاد کرتے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم ان کا جواب ہے۔ یا پھر: نہیں، میں انھیں پیسے بھیج دیتا ہوں۔ کیا وہ لبنانیوں کو پسند کرتے ہیں؟ بے شک وہ ہمارے بھائی ہیں۔ وہ صرف زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان کے پاس بڑی بڑی کاریں اور خوبصورت مکانات ہیں۔

جب میں منیر کو بتاتی ہوں کہ یہاں کچھ نہیں ملنے کا، سوائے آنکھوں تلے حلقے، جھکی کمروں، دکھوں، سیمنٹ ملاتی مشینوں کے منحوس شور، ہتھوڑے برساتے سورج اور سوہانِ روح بارش کے، اور یہ سب کچھ بہت مختصراً چند بڑے مناظر کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، تو اسے بہت افسوس ہوتا ہے۔ اس کی فلم ایک خلا کے گرد گھوم رہی ہے۔ یہ بات واضح ہے۔

اپریل ۱۹۷۵ء کی ۱۳ تاریخ کو نفرت پھٹ پڑتی ہے۔ محرومی کے کئی سو سال نئے سرے سے اپنے اظہار کے لئے ابھرتے ہیں۔ اتوار کی دوپہر فلسطینیوں سے بھری ہوئی بس اپنے کیمپ کو واپس آتے ہوئے، ایک گرجے کے پاس سے گزرتی ہے جہاں فلانجسٹ پارٹی کا سربراہ اور دوسرے عیسائی عبادت کے لئے جمع ہیں۔ اس صبح اس گرجے کے سامنے

ایک فلانجسٹ مارا گیا تھا۔ ایک پھیلایا ہوا جال یا سادہ اتفاق ____ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ملیشیا کے آدمی بس کو روکتے ہیں، اس کے سواروں کو اتارتے ہیں اور ایک کے بعد ایک انھیں مار دیتے ہیں۔ یہ خبر ایک برقی صدمے کی طرح شہر میں پھیلتی ہے۔ ساری دوپہر پر ایک سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ ہر ایک منڈلاتی ہوئی تباہی کو محسوس کرتا ہے۔ رات میں دھماکے شہر کو ہلا دیتے ہیں۔ مشین گنوں کے دھماکے مختصر سے مختصر تر ہوتے ہوئے وقفوں سے سنائی دیتے ہیں۔ فلسطینی اپنے تیس مرنے والوں کا انتقام لیتے ہیں۔ فلانجسٹ حملے کا جواب دیتے ہیں۔

عرب دنیا کے تمام جھگڑوں کے نمائندے یہاں موجود ہیں۔ وہ سب اس قتل و غارت میں شریک ہوتے ہیں۔ بدنصیب اور روندے ہوئے لوگ دہشت زدہ ہیں۔ یہ نئی نسل کا کشت و خون ہے۔ ہر سیکنڈ پر ایک جسم گرتا معلوم ہوتا ہے۔

پیر کی صبح ایک مرسیڈیز کے اطراف لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ ڈرائیور کے سر میں کئی گولیاں لگی ہیں۔ اس کا بھیجا اندرونی دیواروں سے چپک گیا ہے۔ مادہ مادے سے پیوست رہتا ہے۔

بہت سے فرقے عام دہشت گردی میں حصہ لیتے ہیں، لیکن خاص مرکزی کردار دائیں بازو کے عیسائی اور فلسطینی پناہ گزیں ادا کرتے ہیں اور لگتا ہے کہ عیسائی فلسطینیوں کو مکمل طور پر مٹا دینا چاہتے ہیں۔ لڑائی تیزی سے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، ایسی خانہ جنگی جو دیر تک چلے گی۔ اپریل کی ہوا خوشبودار ہے اور گرمی تازگی سے مل گئی ہے۔ اسلحے کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ مقامی ملیشیا کے پاس باقاعدہ فوج سے زیادہ اسلحہ ہے۔

آج شام بجلی کی شعاؤں نے آسمان پر لکیریں بنا کر، اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تقسیم کر دیا۔ سڑکیں جنھیں میں اپنی نویں منزل سے دیکھ سکتی ہوں، خالی ہیں، گویا کسی قدیم مصور کی تصویر میں ہوں۔ کسی موذن کا نغمہ اکرافیہ کے اس عیسائی علاقے میں کہیں

دُور سے آتا ہوا داخل ہوا جس میں ایک غیر ارضی کیفیت تھی۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں یہ صرف ایک ریکارڈ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اپنی تقدیر سے دوچار ہے۔ کوئی آواز غیر اہم اور معمولی معلوم نہیں ہوتی۔ دہشت کی طاقت مکمل طور پر استبدادی ہے۔ گولیاں دراڑیں ڈالتی ہیں اور اس تماشا گاہ میں جو بیروت ہے، گونجتی ہیں۔ اس کھیل کے لئے موزوں ترین مقام ہے۔ بندوقوں کی آواز گونجتی ہوئی سمندر کی طویل پھیلی ہوئی سطح تک نکل جاتی ہے۔

بادلوں کی گرج اس جنگ کی نغماتی آوازوں میں مل جاتی ہے جو بیروت کو پاک کر رہی ہیں۔ یہ شہراب تاجروں کے ہاتھوں سے نکلتا ہے اور قاتلوں کے ہجوموں کی شکل اختیار کرتا ہے جو ایک آفاقی پس منظر میں آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔

ہر اسکوائر میٹر سے تشدد اُبھرتا ہے، جیسے کسی دھات کے جنگل سے نمودار ہو رہا ہو۔ ان دنوں انسانی عقل ایک الگ تھلگ جسم نظر آتی ہے۔ ایک بانجھ قوت۔ شہر ایک مقناطیسی بجلی کا میدان ہے جس میں ہر فرد پیوست ہونا چاہتا ہے۔ یہ اب سکونت کا مقام نہیں بلکہ ایک مغرور ریل سے مماثل کوئی وجود ہے۔ ایذا کا ایک بہت ہی بنیادی خوف مجھے اس جنگ میں شریک ہونے سے روکتا ہے۔ راہ گیروں کا اغوا اور اذیت دہی روزمرہ کے واقعات بن چکے ہیں۔ عورتیں ہمیشہ سے زیادہ اب گھر پر ہی رہتی ہیں۔ وہ جنگ کو مردوں کے درمیان مقابلے کی شام سمجھتی ہیں۔ تشدد کو ایک قابلِ استعمال پیداوار کی طرح جذب کیا جا رہا ہے۔ ایک دن اپنے خانے سے اکھڑے ہوئے ایک برقی تار کے سامنے تشدد کی یہ ضرورت میری سمجھ میں آئی۔ دونوں سوراخوں میں تانبے کے تار کے دو چھوٹے چمکتے ہوئے ٹکڑے رہ گئے تھے جو مجھے پکارتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور میں چاہتی تھی: انہیں چھونا، اپنے ہاتھ پر انھیں یکجا کر دینا۔ اپنے جسم سے وہ لہر گزر جانے دینا اور دیکھنا کہ جل جانا کیسا لگتا ہے؟ صرف ایک غیر معمولی کوشش ہی سے، میں نے اس خواہش پر قابو پالیا۔

تمام ملک بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، تشدد کی اس پکار پر لبیک کہہ رہا ہے۔ قتل کی لذت،

اس ساری سچائی کے ساتھ جوکوئی اس میں پا سکتا ہے، اپنے جوبن پر ہے۔ مورچوں پر جو کہ رکاوٹیں بھی کہلاتے ہیں، اس طرح جیسے کہ ایک علاقے کے غصے کے بوجھ کو دبانا اور دشمن کو دور رکھنا دونوں ضروری باتیں ہوں، نوجوان جو کبھی ٹھیک سے کسی عورت کے ساتھ سوئے بھی نہیں، اپنی خون آلود قمیصوں کی نمائش کرتے ہیں۔ یا اس کے برعکس، وہ ان کاروں میں گھومتے ہیں جن کے سرخ دھبے دھوئے نہیں گئے ہیں۔

ہفتہ لاشیں گننے میں گزرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جنگ بندی سب فریقین کے لئے قابلِ قبول ہوگی۔ پھر سینیچر کی رات عمداً آتش زنی یا سبوتاژ سے بندرگاہ جلنے لگتی ہے۔ الکحل شپنگ کمپنی کی وارثہ اپنی بالکنی پر نکلتی ہے۔ اس کا گھر شعلوں کے بالمقابل ہے۔ بندرگاہ اس کی دیومالا کا حصہ ہے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ واقع اپنے بالا خانے سے وہ آگ بجھانے کے عملے کو بلانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن بندرگاہ صبح سات بجے تک جلتی رہتی ہے۔

اتوار کی صبح، میں ہفتے میں پہلی بار سڑک پر نکلی، میں نے اپنی کار نکالی۔ ایک سرخ سگنل پر، نیلا ہٹ لئے سبز آنکھوں والی ایک چھوٹی سی لڑکی میرے قریب آتی ہے، بھیک کے لئے بھیس بدل کر، میرے ہاتھ ایک چھوٹا سا نیلا پتھر بیچنے کے لئے ...... میں اسے جھڑک دیتی ہوں اور بعد میں افسوس کرتی ہوں، کیونکہ اس لڑکی نے ایک لمحے کے لئے اس بے دہشت شے کو جسے دنیا سمجھتے ہیں، ایک قسم کی زندگی بخش دی تھی۔ یہ سورج بھی کتنا صبر رکھتا ہے۔

ہوچی منہ سٹی پر 'ویت کانگ' کا جھنڈا لہراتا ہے۔ یہ اخبار کی سب سے نمایاں خبر ہے۔ یہ یکم مئی ہے اور رات کو ہونے والے دھماکے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اچانک تمام گردش رک جاتی ہے۔ ہر شخص ایک قید خانے کو بند ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور بہت سے فون کرتا رہتا ہے۔ زمین سکڑ جاتی ہے۔ بالکونیوں اور بالا خانوں سے لوگ گولیوں کی آوازوں کا شمار اور ان کی قسم اور شدت کا اندازہ کرتے ہیں۔ سارا دن یہ جاننے کے لئے کہ کیا ہو رہا ہے، غیر ملکی ریڈیو سنتے ہیں۔ یہاں نہ کوئی حکومت ہے نہ خبریں۔

وہ چاندنی میں لڑتے ہیں۔ رات میں آوازیں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ سلاٹر ہاؤس سے ڈیکوانہ پر اور مکالاس سے تل زعتر کیمپ پر راکٹ پھینکے جاتے ہیں۔ توپ خانہ گونجتا ہے۔ ایک عمودی لکیر میں موت افق کو نابود کر دیتی ہے۔

آدھی رات سے چار بجے تک سڑک پر کاریں ہوتی ہیں، لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ وہ فلانجسٹ ملیشیا کی ملکیت ہیں۔ میرے اپارٹمنٹ میں بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں اور اس کے اطراف خالی زمین ہے، چنانچہ میں اسے ایک رسدگاہ کے طور پر استعمال کر سکتی ہوں۔ پہاڑ روشنی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بجلی ستاروں کے نزدیک چمکتی ہے۔ دھماکے رک رک کر ہوتے ہیں۔ توپیں سڑتے ہوئے خربوزوں کی طرح پچک جاتی ہیں اور مکانات ایک نرم آواز کے ساتھ گرتے ہیں۔ راکٹ عمارتوں پر چابک مارتے ہیں اور ڈائنامیٹ شیطانی آنکھ کی طرح پھٹتے ہیں۔ پھر مشین گن چلتی ہے، عزمِ فتح کے خفیہ پیغامات دیتی ہوئی۔ موت کو فتح بخشنے کے لئے شہر دہشت کے بِل میں مزید گہرا اُترتا جاتا ہے۔ عنقریب یہ شہر اپنی ہی چٹانوں پر پھینکے گئے ایک برباد گولے کے سوا کچھ نہ رہے گا۔

شہر اس سے زیادہ سنسان ہے جتنا کہ کرفیو میں ہو سکتا تھا۔ اب گولیاں چلانے والے نظر نہیں آتے۔ گولیاں خود بخود چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ دو سو سے زیادہ جہاز بندرگارہ پر اپنا سامان اٹھائے جانے کے انتظار میں ہیں۔ جب رات کو ان کی روشنیاں جلتی ہیں تو لگتا ہے بیروت سمندر میں منتقل ہو گیا ہے۔ ایک منٹ میں ساٹھ سے کم سیکنڈ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تیز رفتار ہو گئے ہیں۔

جلدی میں قائم کی گئی فوجی حکومت ''خبر'' کا اعلان کرتی ہے۔ وہ جو نشر کرتے ہیں وہ بہر حال جنگ کی رپورٹ نہیں بلکہ اذیت دہی کی رپورٹ ہے۔ ہر گھنٹے ریڈیو خبریں دیتا ہے: لوگوں کے اندھے کیے جانے کی، نازک اعضا کاٹ دیے جانے کی، عام مقامات پر پھینکے گئے کٹے ہوئے جسموں سے بھرے نائیلون کے تھیلوں کی، باورچی خانے کے چاقوؤں

سے اموات کی، ایک ہولناک جراحی، قبرستان میں اذیت دہی کی۔

منیر اور اس کے دوست میرے مکان پر ہیں۔ منیر فلانجسٹوں کی مالی امداد کر رہا ہے،
ءوہ کہتا ہے، لبنانی دائیں بازو اور کاروبار کا دفاع کر رہے ہیں۔ ٹونی کا تعلق پارٹی سے نہیں
ہے نہ ہی اس کا اپنا ہے مگر وہ اس کی ''حمایت'' کرتا ہے۔ اس کو اس کے دوست جو پہلے ہی
ارٹی کے رکن ہیں، مشورے دیتے ہیں۔ وہ لڑنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے،
ھیں تسلی دیتا ہے اور ایک رابطہ کار کن کی حیثیت سے ان کے کام آتا ہے۔ اس کے دوست
رطرف پھیلے ہوئے ہیں اور وہ انھیں دشمن کیمپ کی خبروں سے مطلع کرتا ہے۔

''فلسطینی بہت زیادہ مایوس ہیں۔'' وہ کہتا ہے: ''کیمپوں میں وہ کھلے ہوئے گڑھوں
کے بالکل برابر پناہ گاہوں میں سوتے ہیں۔ ان کے ایک ہزار آدمی مارے گئے ہیں۔''

''یہ کچھ بھی نہیں،'' فواد کہتا ہے: ''اس کی مقابلے میں جو اِن کے ساتھ ہونے والا
ہے۔ ہمارے صرف ایک سو پچاس آدمی مارے گئے ہیں، بس۔ باقی سب شہری تھے۔ اتنی
ساری ضائع شدہ گولیاں! جیسے ہی کچھ سکوت ہوگا ہم پہاڑوں کے دیگر مقامات پر مزید
بندوقیں لگا دیں گے۔ ہر طرف سے ان پر گولیاں برسیں گی۔''

وہ پیتے ہیں، وہ کھاتے ہیں، وہ چلے جاتے ہیں۔ عمارت کا چوکیدار آتا ہے۔ اس کا
صرف ایک ہاتھ ہے۔ دوسرا کام کے دوران حادثے میں ضائع ہوگیا ہے۔ یہ بات اسے
ایک کلاشنکوف لینے سے نہیں روکتی۔ وہ خستہ حال ہے۔ وہ لوگ برابر والی عمارت سے گولیاں
چلا رہے ہیں۔

میں کہتی ہوں: ''وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ برابر والی عمارت میں شامی مزدوروں کے علاوہ
کوئی نہیں ہے اور وہ کئی روز سے اپنی سیمنٹ کی دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔''

میں باہر بالکنی میں جاتی ہوں۔ باہر رات میں، ایک صف باندھے ہوئے، اپنے
بازوؤں کو عالمِ شکستگی میں سروں سے اوپر اٹھائے ہوئے، شامی مزدور ملیشیا میں گھرے

ہوئے ہیں اور پارٹی کے تحقیقاتی مرکز کو لائے جاتے ہیں۔ میں اس بزنس مین کو فون کرتی ہوں جو سڑک کے اس پار رہتا ہے اور میرا دوست ہے۔ ''دیکھو یہ لوگ ان مزدوروں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ ملیشیا کے لوگوں سے کہو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ معصوم ہیں۔ ملیشیا کے افسر تمھاری بات سنیں گے۔'' لیکن وہ شخص جو اپنی ساری دولت کے لئے خلیج کے عربوں کا مقروض ہے، عربوں سے نفرت کرتا ہے اور مزید یہ کہ کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے بستر میں چھپ جاتا ہے۔

میں اپنے آپ سے کہتی ہوں: یہ بہتر ہوگا کہ لبنان کے آسمان پر دس لاکھ پرندے کھلے چھوڑ دیے جائیں تا کہ یہ شکاری ان پر طبع آزمائی کرتے رہیں اور خون ریزی سے بچا جا سکے۔

سیاسی گفت وشنید کے لئے عیسائی ملیشیا کی عراقیوں کو دعوت دینے کی ایک غیر مصدقہ کہانی نئی جنگ کے شعلے بھڑکا دیتی ہے۔ ابھی اتنی کم مدت میں ہی یہ جنگ کا تیسرا لگان ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ منحوس سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اپنے ٹیرس سے میں اس نوجوان جوڑے کو جو نیچے رہتا ہے، عین دوپہر میں برآمدے میں جنسی عمل میں مصروف دیکھتی ہوں۔ حالیہ واقعات نے ان کے ہوش اڑا دیے ہوں گے۔ مناسب حالات میں وہ اتنے پاگل نہ ہوتے، ہوسکتا ہے وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میرے لئے وقت مردہ ہو چکا ہے۔ عمل اس طرح ٹکڑوں میں بکھر چکا ہے کہ کسی کے پاس پورے مرحلے کا ایک صحیح تصور باقی نہیں۔ ان لوگوں کا تخیل جو گھروں میں بند ہو گئے ہیں، قریب ترین بمباری تک بھی سفر نہیں کر سکتا۔ وہ پولیس چوکیوں کے سامنے ہی رک جاتا ہے۔

میری ریڑھ کی ہڈی ایک مڑے ہوئے، بے حس گرے ہوئے درخت کی طرح ہے

ہو دھوپ میں غائب ہو رہا ہو۔ نہایت توجہ کے ساتھ صبح کا اخبار پڑھتی ہوں۔ اس کے گھٹے ہوئے صفحات پر، ایک کے بعد ایک چھوٹے پیراگرافوں میں، اس دن کے تمام مظالم باقاعدگی سے پیش کیے جاتے ہیں۔ فضا دہشت کے سلسلوں سے بھری ہوئی ہے جو ناقابلِ یقین رفتار سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے جاتے ہیں۔ جرائم کا تنوع دن کی کشادہ روشنی میں نمایاں ہوتا ہے جب فریقِ مخالف کی طرف سے، فلسطینی ہو یا بایاں بازو، حملہ ہوتا ہے۔ اس کا جواب بلا تاخیر دیا جاتا ہے۔ وہ مسلم ہمسایوں یا کیمپوں پر گولیاں چلاتے ہیں یا پھر بلا وجہ شامی مزدوروں کو گرفتار کر لیتے ہیں، سڑکوں پر سے، اگر یہ ممکن ہو تو، ورنہ زیرِ تعمیر مقامات سے...... پھر یہ بیس یا تیس کی گٹھریوں میں مردہ خانے لائے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی ایک شخص کو مارتے ہیں تو اسے تیزی سے ہٹائے جانے کے لئے سڑک پر ہی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ ان چھوٹی سڑکوں پر کوئی وبا نہ پھوٹ پڑے جن پر ہلاکت بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔

پیمانۂ صبر کی لبریزی اور افراتفری محسوس ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ دوستوں کے درمیان فون کالز مختصر اور تعداد میں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ سڑک پر زیادہ سے زیادہ کم عمر ملیشیا کے جوان نمودار ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کو ان کی پھرتی کی وجہ سے بھرتی کر رہے ہیں۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ کے نیچے رینگتے ہیں اور دشمن کیمپ میں چھوڑے ہوئے ہتھیار جمع کرتے ہیں۔ وہ پارٹی سے محبت کرنا اور مرنا بھی سیکھتے ہیں۔

ہسپتال بھرے ہوئے ہیں۔ جونہی سکون کی کوئی لہر ایک گھنٹے سے زیادہ قائم رہتی ہے، لوگ زخمیوں سے ملنے ہسپتال جانے کی جرأت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھ یا پیر کاٹ دیئے گئے۔ ایسے مریض جن کے لئے امید نہیں کی جا سکتی، ہال میں انتظار کرتے ہیں۔

میری آنکھیں ان پودوں کی طرح ہیں جو دن میں کھلتے اور رات کو بند ہو جاتے ہیں۔

میرا دل چاہنے لگا ہے کہ دو راکٹ میرے سر میں سے گزر جائیں، مجھے صحیح سالم چھوڑ کر، یہی اس کا مطلب ہے۔ ہر شے دورِ قدیم میں چلی گئی ہے۔ ذرات اپنے ابتدائی دنوں کے سورج کی نبضوں کو یاد کرتے ہیں، دورِ ماضی میں جب سوئے ہوئے تھے۔ قبل از انسان زمانے میں۔ ہر بات جو سیکھی گئی ہے، دھندلی پڑتی نظر آتی ہے۔ اجسام بھی نفرت کی طرح پھٹتے ہیں، ان لیموؤں کی طرح جنھیں پھاڑ دینے کی حد تک دبا دیا گیا ہو۔

ریڈیو اعلان کرتا ہے کہ عوامی دباؤ کے تحت ایک دفعہ پھر ایک نئی حکومت قائم کی گئی ہے۔ پھر بھی کوئی سڑک پر نکلنے کی جرأت نہیں کرتا۔ دھماکے کم ہو گئے ہیں۔ خاموشی کے وقفے البتہ صبر آزما ہیں، کیونکہ اگلے واقعے کا انتظار ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے دھماکے ایک ضروری احساسِ آزادی فراہم کرتے ہیں۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بدھ کی صبح ایک نسبتاً خاموش رات کے بعد، لوگ آزمائشی طور پر باہر نکلے۔ ایک گرم سڑاند کا تعفن حلق کو جکڑ لیتا ہے۔ آج ۲ جولائی ہے اور سورج تیزی کے ساتھ ہر جگہ چمک رہا ہے۔ سورج ان سب کو جو اندر چھپے رہتے ہیں، بیزار کرتا ہے۔ کوڑے کے ڈبوں کے پہاڑ سے بن جاتے ہیں جن پر اس شہر کے، جس میں کوئی پارک، کوئی باغ نہیں ہے، بچے کھیلتے ہیں، امیر اور غریب دونوں۔ کوڑے کے ڈبوں نے سڑکوں پر انسانوں کی جگہ لے لی ہے۔ وہ لاتعداد...... اور ہر جگہ موجود ہیں۔ موسم گرم ہے اور ہوا تیز۔ کئی دکانیں لوٹی یا تباہ کی گئی ہیں۔ پسا ہوا شیشہ واحد شے ہے جو اس گندگی میں صاف معلوم ہوتا ہے اور سڑکوں کے تارکول پر جھلملاتا ہے۔

کیفے ایکسپریس میں چند لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اے این مجھے بتاتا ہے کہ عرب بھی دشمن کی نفرت کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف آپس ہی میں نفرت کرتے ہیں۔ وہ اب تک اس قدیم زمانے میں ہیں جب کہ صرف خاندانی جھگڑے ان کے لئے دلچسپ ہوتے تھے۔ بے مقصد لڑائیاں، برادر کشی...... وہ اپنے آپ ہی میں مگن ہیں۔ اس طرح وہ اس خانہ جنگی کی

وحشت ناکی کی وضاحت کرتا ہے جو ایک جنگ بھی نہیں ہے۔

سڑکوں سے گزرتے ہوئے، میں شہر کو پار کرتی ہوں۔ بیروت کی ذلت ہوئی ہے۔ اس نے شکست کی تکلیف اٹھائی ہے۔ صرف اس کا نقصان ہوا ہے۔ وہ اپنی دم اپنی ٹانگوں کے درمیان دبائے ایک کتے کی طرح ہے۔ اس نے احمقانہ حد تک غفلت برتی ہے۔ اس نے ساری دنیا کے اطوار اور رسمیں، خامیاں اور انتقام، احساسِ جرم اور بدکاری اپنے پیٹ میں جمع کر لیے۔ اب اس نے ان سب کو الٹ دیا ہے اور اس قے سے اس کی ساری زمین بھر گئی ہے۔ عیسائیوں کے علاقے میں ایک شدت بھرا، اور درشت، کٹر، غرور آدھے مستول پر اپنا جھنڈا لہراتا ہے۔ چہروں پر سختی کے تاثرات ہیں۔ نوجوان جو خاکی کپڑوں میں ملبوس ہیں، وہ جو رائفلیں ساتھ لے کر چلتے ہیں، وہ جو بغیر لائسنس پلیٹوں کے جیپیں چلاتے ہیں، وہ جواب تک کلاہ پہنتے ہیں، وہ جو بغیر کسی تضاد کو سمجھے انقلابی عوامی روایات کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ جو ہر گزرتی کار پر تھوکتے ہیں، وہ جو فلانجسٹ اخبار بیچتے ہیں، وہ سب جھوٹی فتح کے نقاب پہنتے ہیں۔

مسلمانوں کے علاقے زیادہ بے ترتیب اور زیادہ رنگین ہیں۔ یہاں کوڑے کے ڈبے بھی زیادہ بڑے اور زیادہ نمایاں ہیں۔ یہاں آنکھوں میں بہادری کی نمائش کم اور غمزدہ قناعت زیاد ہے۔ ہونٹوں کے گرد ایک سلوٹ کے علاوہ اب کوئی ہیبت باقی نہیں ہے۔ مورچوں کی باقیات زیادہ نمایاں ہیں اور زیادہ برمحل بھی اور ایک خاص قسم کی لاپرواہی اعضا کی حرکات، چہروں اور فضا میں اپنا تاثر چھوڑ رہی ہے۔

عیسائی علاقہ جو زیادہ مغربیت زدہ اور ہر بات کی طرح جنگ میں بھی زیادہ با صلاحیت ہے، ایک طرح کی سختی لیے ہوئے ہے جو اس کا رشتہ مارسیلز اور نیس کے الجیریائی علاقوں یا یونان اور سسلی کے چھوٹے قصبات سے جوڑ دیتی ہے۔ مسلمانوں کے گھرے ہوئے علاقوں میں اب تک مشرق کی بے ترتیبی قائم ہے جو اُن بنیادی طور پر ناجائز ملکوں کی

آخری خوبی ہے جن کی کوئی واضح تہذیب نہیں ہے سوائے اس کے جو ایک حالتِ انتشار میں اقدار کی بدنظمی سے پروان چڑھی ہے۔ انسانیت کی کسی شباہت کو پانے کے لئے جو ایک قطب نما کی طرح اب تک نوعِ انسانی کے مقناطیسی شمال کا نمایاں نشان ہے، آپ کو ایک کونے میں آلتی پالتی مارے کسی شخص کو ڈھونڈنا پڑے گا، کسی ایسے شخص کو جو اب تک اس طوفانی آندھی سے جنونی نہیں ہوا ہے۔

لیکن سوائے اس شہر کے باشندوں اور چند جانوروں کے، جنھیں لوگ کھانا کھلانا بھول گئے یا جو گولیوں کی بارش میں مارے گئے، کس کا واقعی نقصان ہوا ہے؟ گھوڑے ہپوڈروم میں اپنے اصطبلوں میں جل گئے۔ یہ شہر ایک عظیم اذیت زدہ وجود کی طرح ہے۔ بہت پاگل، بہت مضطرب، ٹوٹا ہوا، لٹا ہوا، آبروریزی کا شکار، ان لڑکیوں کی طرح جن کی ملیشیا کے تیس یا چالیس آدمیوں نے عصمت دری کی اور جو اَب پاگل خانے میں ہیں کیونکہ ان کے خاندان، سرتاپا بحیرۂ روم کے باسی، علاج کرانے کے بجائے چھپانا زیادہ پسند کریں گے...... لیکن کوئی یادوں کا علاج کرے بھی کیسے؟

یہ شہر ان لڑکیوں کی طرح آبروریزی کا شکار ہوا۔ ایک مرسیڈیز ٹیکسی میرے پاس سے گزرتی ہے، جلی ہوئی، جسے ایک دوسری ٹیکسی گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔ اس کا کالا پینٹ جُھلسا ہوا ہے، انسانی گوشت کی طرح۔ یہ دو ٹانگوں کے بجائے چار ٹانگوں پر کھڑے انسان کی طرح ہے جسے کھینچ کر ہسپتال لے جایا جا رہا ہو یا شناخت کے لئے مردہ خانے میں۔ جو کچھ پیش آیا یہ اس کی ایک تلمیح ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اب قدرے سکون ہو گیا ہے۔ جمعرات کی صبح تین جولائی کو میں نے اخبار پڑھا۔ اس میں پھر وہ حال میں مشہور ہونے والا تازہ ''واقعات'' کا کالم ہے۔ شاید کافی عرصے کے لئے یہ آخری ہو۔ میں نے نامعلوم اور شناسا سب لوگوں کے لئے دعائے

مغفرت پڑھی اور ناموں اور حقائق کی بھاگتی ہوئی فہرست کو تیزی سے زیرِ زمین یادداشت میں چھپا لیا، بالکل جوں کے توں، جیسے وہ بیروت کے فرنچ زبان کے روزنامے میں شائع ہوئے تھے۔

''عیسائیوں کے علاقوں کو ان مسلح نوجوانوں سے خالی کرا لیا گیا ہے جو ان پر قابض تھے۔ ایک نوجوان مارسل یوسف منصور نے، جس پر تعیون میں ایک عمارت کی چھت پر ایک نامعلوم شخص نے گولی چلائی تھی، لوتیل دیو میں زخموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیا۔ بن الفی کے حماد اعظم کا بھی انتقال ہو گیا۔

☆ ان بارہ لاشوں کو ہٹانے کا کام، جو اشرافیہ اور پلاس دیبا میں پورٹ کی سڑکوں پر پڑی ہوئی تھیں، بغیر کسی ہنگامے کے تکمیل کو پہنچا۔

☆ ایک نامعلوم گولی باز نے دورا میں سینٹ جوزف ہسپتال کے قریب ایک علاقے میں افراتفری پھیلا دی۔ پولیس نے اسے گرفتار کرنے کے لئے تلاشی شروع کر دی ہے۔

☆ ژاں یوسف خاشان، یاسین عبداللہ باشا، یوسف فارسین احمد محمد ہجری، علی حسن غدود اور محمد علی موسیٰ عین الرمانہ میں نامعلوم لوگوں کی گولیوں سے مارے گئے۔

☆ دورا کٹوں نے عبدالقادر زعتاری کے مرکز کو تباہ کر دیا۔

☆ صبح پانچ بجے دو گولے طارق جدیدہ کے پولیس اسٹیشن پر گرے۔ تین پولیس آفیسر مارے گئے۔

☆ ریوسنا کین میں تقریباً ایک بیس سالہ آدمی کی لاش پائی گئی۔ اس کا چہرہ بری طرح مسخ ہے۔ مقتول کی شناخت کے لئے تفتیش جاری ہے۔

☆ زا حلے ضعر رالشر یر میں ٹوایٹی کے قریب اینتوئنی یعقوب مبارک (عمر ۳۸ سال) اور ژاں الیاس ابو آسی (۲۰ سال، بنیادی تعلق حادث سے) کی لاشیں پائی

گئیں۔ انھیں مبارک کی کار میں مارا گیا (مرسیڈیز رجسٹر نمبر ۱۳۵۵۲۵) اور ان کی لاشیں ایک کھائی میں پھینک دی گئیں۔ اسی سڑک پر، جو غیر محفوظ خیال کی جاتی ہے، داؤد خراط کی لاش بھی پائی گئی۔

☆ ایک توپ کا گولہ حنانہ کے قریب باغِ عام میں گرا جس سے ایک لڑکی کی موت واقع ہوئی۔

☆ منگل کی رات ایک نامعلوم شخص نے ساکرے پر لویا زے میں گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ بعد میں وہ اپنی کار کے پہیے پر پایا گیا۔ اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔

☆ تین شامی مزدوروں کی لاشیں دیکوانہ میں ان کے کمروں میں پائی گئیں۔

شام کے سرخ آسمان میری آنکھوں کے سامنے صف باندھے گزرتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اب پڑھنا جاری رکھا جائے۔ ایک ماہ سے میں ہر روز یہ سب کچھ پڑھ رہی ہوں۔ آج صبح میں نے منیر کو فون کیا: ”تم نے اخبار دیکھا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ کہتا ہے: ”ہاں!... کیوں؟“

”تمھیں معلوم ہے۔ وہ تین شامی مزدور جو دیکوانہ میں اپنے کمروں میں مردہ پائے گئے، جن کے سروں میں گولیاں لگی تھیں۔ تمھیں معلوم ہے؟“

”ہاں!... کیوں؟“

”تمھارا کیا خیال ہے، جب تم اپنی فلم بناؤ ہم اسے اس طرح ختم کریں۔ تین شامی مزدور جنھیں تم ان کے گاؤں سے لاؤ وہ اس طرح اپنے کمرے میں مر جائیں۔ تقریباً دو سو سے زیادہ اس طرح مارے گئے ہیں۔“

”نہیں۔ اس صورت میں لبنان میں، میں اپنی فلم کبھی نہیں دکھا سکوں گا۔ دوسرے

عرب ملکوں میں بھی نہیں اور اس کے علاوہ یہ ٹھیک نہیں۔ میں چاہتا ہوں میرے مزدور لبنان میں تکلیف اٹھائیں، مگر اتنی زیادہ نہیں۔ یہ بہت زیادہ تشدد ہے۔ بہت زیادہ سیاسی ہے۔ اور پھر یہ کہ اپنے نقطۂ نظر کا دفاع کرنے کے لئے میں ان میں سے ایک کو اس کے گاؤں واپس بھیجنا چاہتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے منیر کہ میں واقعی تمھارے ساتھ یہ فلم نہیں بنا سکتی۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ ٹونی، فواد اور میں اس بارے میں بات کریں گے۔ مجھے کوئی اور مل جائے گا۔ تم آج رات کے کھانے پر آجاؤ۔''

دوسرا زمانہ

میری روز

ایک

۲

میں یہاں کیوں آئی؟ میں اس اسکول کی ڈائریکٹر ہوں اور یہاں پڑھاتی ہوں۔ مجھے ٹیچروں کی تنخواہ دینی تھی اور خود کو دوبارہ ان بچوں کے درمیان پانا تھا۔ میرے اپنے بچے شہر کی دوسری طرف ہیں۔ یہ والے بچے اس قدر غیر محفوظ ہیں۔ یہ بندوقوں کی آوازیں نہیں سن سکتے، مگر یہ اور بھی بدتر ہے، کیونکہ یہ انھیں محسوس کر سکتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ ان کی خلا کو مسلسل تاراج کیا جا رہا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ عمارتیں گرتی ہیں۔ یہ ملبے پر چلتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ لوگ مر رہے ہیں۔ یہ دوہری دیواروں میں مقید ہیں، ان واقعات کی جنھوں نے ان کے ملک کو اپنے اندر قید کر لیا ہے اور اپنے دوسرے اپاہج پن کی قید میں ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ مجھے ہر ایک نے تنبیہ کی تھی کہ اس خط کو پار نہ کروں جو شہر کو دو دشمن علاقوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس عیسائی علاقے میں نہ آؤں جہاں میں ہمیشہ سے رہتی آئی ہوں۔ لیکن سیز فائر ہو گئی تھی اور وہ عام طور پر عورتوں کو پریشان نہیں کرتے۔ اور یہ جتنے عرصے جاری رہتا ہے، اتنی ہی ہماری احتیاط کمزور پڑتی جاتی ہے۔ اس لئے میں نے خود کو سمجھا لیا کہ یہاں آنے میں اب اتنا خطرہ نہیں جتنا عام طور پر سڑک پار کرنے میں ہوتا رہا

ہے۔ وہاں ان ''واقعات'' سے پہلے، پیدل چلنے والے مکھیوں کی طرح مرتے رہتے تھے۔ قاتل ہتھیاروں کی پیش رو تو کاریں تھیں۔ وہ بھی اسی بے رحم تھکی ہوئی اکتاہٹ سے چلائی جاتی تھیں۔

میں غیر محتاط تھی، میں تسلیم کرتی ہوں۔ اور میری زندگی کا دارومدار احتیاط پر ہے۔ مجھے علم تھا کہ دونوں جانب اسی قسم کی اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں، اس جنگ میں جس میں بہادری اور بزدلی متصل ہیں اور فریقین میں ایک ہی کے اندر باہم دگر مدغم ہو جاتی ہیں۔ میں خود مغربی بیروت میں ایسے ہی ایک اغوا کی دہشت زدہ تماشائی رہی تھی۔ ان فریب دیئے والے پھیلے ہوئے جالوں میں سے جو ایک عظیم الجثہ، متعدد اشکال والے کن کھجورے کی زبان کی طرح ہیں اور جن میں غیر مسلح لوگ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا، میرے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ میں بھی اپنے آپ کو اسی جال میں گرفتار دیکھوں گی، اسی بے بسی کے کوڑے مارتے ہوئے جال میں۔ لیکن انھوں نے مجھے پکڑ لیا، اس اسکول سے چند گز کے فاصلے پر، اس گلی میں...... جہاں لگتا تھا ہر ایک مجھے پسند کرتا تھا۔ انھیں بچوں کے والدین کی آنکھوں کے سامنے جو اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں، اپنی آنکھیں کھولے ہوئے، مجھے اشارے کرتے ہوئے۔ گلی میں سے کوئی شے متحرک نہیں ہوئی سوائے میرے گرفتار کرنے والوں کے۔ بشمول ایک شہد کی مکھی کی ایک درخت سے دوسرے تک پرواز کے، ہر شے کسی اسٹیج پر ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا: ''ہمیں آپ سے بات کرنا ہے:'' اور میں سمجھ گئی۔ ان الفاظ کے ساتھ میں عام گفتگو کی دنیا چھوڑ رہی تھی۔

۳

میرا اِس اغوا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصولی طور پر میں ہر اس کارروائی کے خلاف ہوں جو پورے طور پر فوجی انداز سے نہ کی جائے۔ پارٹی کے مرکزی دفتر میں، مَیں نے انھیں بتایا تھا کہ اس طریقے پر عمل نہ کریں۔ ہم اس کے بغیر بھی اپنے دشمنوں تک پہنچ جائیں گے۔ اس شہر میں فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہ ایک یک طرفہ شہر ہے۔ ایک طرف سمندر ہے اور مشرق پر ہمارا قبضہ ہے۔ ہم ایک وسیع دائرے کی شکل میں مغرب کی طرف بڑھیں گے۔ ہم یکے بعد دیگرے آباد بستیاں خالی کرادیں گے۔ پھر ہم شہر کے جنوب میں ہوائی اڈے پر بمباری کریں گے اور دائرہ بند ہو جائے گا۔ تین دن کی شدید بمباری کے بعد، ان سب کو گرفتار کرلیا جائے گا۔ دوسری طرف رہنے والے ناعاقبت اندیش دوست، دشمن، خود غیر جانبداری کا اعلان کرنے والے، سب کو۔ یہ ستھرا اور فیصلہ کن عمل ہوگا۔ ایک فاتح ہوگا اور ایک مفتوح، اور ہم مذاکرات کرنے کے اور ایک نئی بنیاد پر ملک کی تعمیر کرنے کے قابل ہوں گے۔ لیکن لوگوں کو اس طرح غیر منظم انداز میں فریقین میں قیدی بنانا قطعی بے معنی ہے۔

میں ان کا دوست ہوں، یہ درست ہے۔ مگر میں اس شعبے کا سربراہ بھی ہوں۔ میں اپنے ساتھیوں سے ''نہیں'' تو نہیں کہہ سکتا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ ایک خاص لوٹ کا مال

ہے، ایک نہایت ہی خراب قسم جو ہم آپ کے پاس لا رہے ہیں۔ آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں؟

میں نے دیکھا۔ میں نے میری روز کو دیکھا۔ میں توقع کرتا تھا کہ وہ شکست خوردہ، شاید بدہیئت اور وحشت زدہ ہوگی۔ نہیں، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، اتنی ہی خوبصورت جتنی کہ وہ اس وقت تھی جب ہم دونوں سولہ سال کے تھے اور بیروت کے ہائی اسکول جاتے تھے۔ وہ اب بتیس سال کی ہے اور ایک ملکہ کی طرح چلتی ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں وہ خوبصورت ہے۔ وہ اسی سڑک پر رہتی ہے جہاں میں اب تک رہتا ہوں۔ اس نے شادی کر لی، اسی طرح میں نے بھی کی۔ اس نے تین بچوں کے بعد طلاق لے لی۔ میں نے کوئی بچہ ہونے سے پہلے ہی۔ میں وہ دن نہیں بھولا ہوں جب اپنے والدین کے باغ کے سامنے میں نے پہلے بار اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ہم ہنس رہے تھے۔ ''تم کسی عرب کی طرح نہیں لگتیں،'' میں نے اسے بتایا۔ ''نہ ہی تم۔'' اس نے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے قابل ہے کیونکہ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ ''تم فلموں میں آنے والی لڑکیوں کی طرح لگتی ہو،'' میں نے اسے بتایا، ''تم اتنی موڈرن ہو۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور کہا: ''تم پورے اسکول میں سب سے خوبصورت لڑکے ہو۔'' اس لمحے سے پہلے جب میں اسکول کے صحن میں نل کے قریب اس سے ملا اور اس نے پانی کے چند قطرے میرے چہرے پر پھینک دیے، مجھے اپنی بائیسکل کے علاوہ کسی چیز سے محبت نہیں تھی۔ اس کے بعد میں اس کے چہرے سے محبت کرنے لگا۔ میں ہر روز اسکول کے بعد اس کا انتظار کرتا تھا تاکہ اس کے گھر تک اس سے چند قدم پیچھے ہٹ کر چل سکوں اور محلے والوں کو پتا نہ چلے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان گرمیوں میں بھی جو ہم نے ایک گاؤں میں گزاریں۔ صرف ایک بار میں نے اس کے بالوں کو چوما۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھولا۔ پتا نہیں اسے یاد رہا یا نہیں۔

میری اس سے محبت ماند پڑ گئی ہے مگر وہ میرے لئے کوئی اجنبی نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں اور کسی کو جاننا ایک غیر معمولی طور پر مضبوط بندھن ہے۔ یہ جانداروں کے اور حتیٰ کہ چیزوں کے درمیان بھی ایک مقناطیسی رابطہ قائم کر دیتا ہے اور ہر شے کو زیادہ جاذب اور روشن کر دیتا ہے۔ وہ یہاں میرے سامنے ہے۔ وہ میرے لئے مانوس ہے اور پھر بھی اس بات کا فیصلہ مجھ پر ہے کہ وہ زندہ رہے یا مر جائے۔ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟

لیکن چونکہ مجھے فیصلہ کرنا ہے، کچھ باتیں ایسی ہیں جنھیں جاننا پڑے گا۔ راہوں کا، مراحل کا اور موڑوں کا وہ کون سا سلسلہ ہے جس نے اسے اس صورتِ حال تک پہنچا دیا۔ میں نے اس کا نام اخباروں میں پڑھا، اسے ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ اپنے مختلف مقاصد کے راستوں پر چلتی ہوئی۔ پہلے تعلیمی اصلاح، پھر طباعت کرنے والوں کی ہڑتال، پھر آزادیٔ نسواں......

مجھے یہ سب بہت مضحکہ خیز لگا۔ اب مجھے اس بارے میں اتنا یقین نہیں رہا۔ اس ملک میں چیزیں بدل گئی ہیں۔ ہاں ایک عورت کو دوست یا دشمن، ایک اہل ساتھی تصور کرنے کے لئے، مجھے ایک سال کی خانہ جنگی، بیروت میں سینکڑوں اموات اور خدا اور زمین کے درمیان ایک قدیم معاہدے کی تنسیخ جیسے عوامل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن میں ان چند لوگوں میں سے ہوں جو اس بات کو تسلیم کر لیں گے۔

۴

منیر اور یہ عورت ایک دوسرے کو بغیر نفرت کے دیکھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔
وہ عیسائی ہے اور وہ مسلم کیمپ میں گئی۔ وہ لبنانی ہے اور وہ فلسطینیوں کے کیمپ میں گئی۔
بات بالکل سیدھی سی ہے۔ ہمیں ہر دوسرے دشمن کی طرح اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے۔
میرا نام ٹونی ہے اور یہ کبھی محمد نہیں ہوگا۔ یہ بات اتنی ہی واضح اور ناگزیر ہے جتنا کہ گھنٹوں کا یکے بعد دیگرے گزرنا۔ اور کوئی کچھ بھی کہتا رہے گروہ کی مشیت کی برتری صادق ہے۔ ہم عیسائی نوجوان ہیں اور ہماری ملیشیا فلسطینیوں سے جنگ کر رہی ہے۔ وہ مسلمان ہیں، اس لئے ہم اسلام سے جنگ کر رہے ہیں، خاص طور پر جب وہ ہمارا راستہ روکتے ہیں۔ اگر ہم چیلوں کے جھنڈ کے خلاف گدھوں کا جھنڈ ہوتے، تو بھی یہ ایسی ہی بات ہوتی۔ اور اس جنگ میں کوئی قیدی نہیں ہیں۔ کچھ بھی رکھنا نہیں ہے۔ یہ بات طے ہے۔
ہمیں ان پر دباؤ ڈالنا ہے۔ یہ عورت ایک کتیا کے سوا کچھ نہیں۔ منیر کو اسے ایک عام شخص نہیں خیال کرنا چاہیے۔

۵

میں نے اس شہر کی پہاڑیوں پر توپ خانہ اپنے آپ کو ایک عورت کے متعلق کسی کہانی میں شامل کرنے کے لئے نصب نہیں کیا۔ میں نے یہ چیزوں کو اڑانے کے لئے نصب کیا ہے۔ ملیشیا محکوموں کے بغیر ایک حکومت ہے۔ ملیشیا ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ اپنے ہر فیصلے میں انھوں نے مجھ سے کہا، ''فواد! تم ایک انتشار پسند ہو۔ تم عمارتوں کو اُڑا ڈالتے ہو۔ تم ایک پورے علاقے کو صاف کر ڈالتے ہو جیسے کہ وہ ایک تربوز ہے۔'' لیکن میں ان سے کہتا ہوں: ''میں مطلق تنظیم ہوں، میں مطلق طاقت ہوں، میں مطلق قابلیت ہوں۔ میں نے تمام سچائیوں کو زندگی اور موت کے ضابطے تک گھٹا دیا ہے۔''

۷

ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن چکے ہیں۔ ہم تکمیل شدہ نظام ہیں۔ میں نے ایک پودا دیکھا جو مجھے بہت سادہ لگا اور یہ جاننا بھی کہ کس سمت بڑھ رہا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو کہنے دیا: ''میں اس کی طرح ہوں، میں بلند ہوتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو اُٹھاتا ہوں، میں اس شہر کے اوپر منڈلاتا ہوں، اس ملک کے اوپر اور اس براعظم کے اوپر۔ اس سرزمین پر جو کچھ ہے میں اسے کبھی نظر سے اوجھل نہیں کرتا۔ میں نے قریب سے اس کا مشاہدہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ میں اس کی ارضیات سے اپنی شناخت کرتا ہوں۔ میں نے ان دھاروں کا معائنہ کیا ہے جو دنیا کے اس خطے سے گزرتے ہیں، کچھ کو اختیار کرتے ہوئے، کچھ کی مخالفت کرتے ہوئے، جھوٹے معاہدوں کے نظام درہم برہم کرتے اور غداروں کی بُو ہانڈی میں لہسن کی طرح سونگھتے ہوئے۔ میں جانتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر درحقیقت میں پودے سے زیادہ ایک چوپائے کی طرح ہوں۔ میں ہمیشہ اپنا سر زمین کی سمت کئے چلتا جاتا ہوں۔''

میں شباب مافیا کو جانتا ہوں، وہ لڑکوں کی ٹولی۔ انھیں ہمیشہ ضرورت رہتی ہے کہ

اکیلے مل سکیں۔ وہ خودنمائی کے لئے زندہ ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے فولاد کے مانند جڑے ہوئے ہیں۔ وہ جنگلی موروں کی شان سے قدم بڑھاتے ہیں۔ میں پادریوں، خود ساختہ جیالوں، ادیبوں، عورتوں سب کو جانتا ہوں۔ یہ بنیادی طور پر ایک بیزار کن اور اکتا دینے والی دنیا ہے اور پھر بھی میں اسے چھوڑتا نہیں ہوں۔ میں بھی ان کے درمیان رہتا ہوں کیونکہ جاننا چاہتا ہوں۔ ان کے خیالات کو ہرگز نہیں، وہ ایک دھواں آلود بگولے سے زیادہ کچھ نہیں ہوں گے۔ یہ ان کا گوشت ہے جو دلچسپ لگتا ہے۔ ان کے جسموں کے اندر ان کے ہزار سالہ ادوار ہیں جن کا دن کی روشنی میں انکشاف ہونا چاہیے یا خوربین سے جائزہ لیا جانا چاہئے۔ ان کے دماغ یادوں کی ایک دوسرے کے اوپر چڑھی تہوں سے اٹااٹ بھرے ہیں، جس طرح ان کی پہاڑیاں ان کے مردہ شہروں سے بھری ہیں۔ یہ خانہ جنگی ایک لیزر ہے جس نے ان کی شناخت کے مرکز پر چوٹ ماری ہے۔ یہ ایک نیوکلیائی دھماکہ ہے جو کسی بم، کسی بیرونی شے سے نہیں بلکہ اس نسل کی یاداشت کے مرکز سے ہوا ہے۔ جتنا تشدد کے غلبے میں مبتلا ہوتے ہیں اتنا ہی اپنی اصلیت سے قریب ہوتے ہیں۔ اس شہر میں رہتے ہوئے جو زندگی کو ست بنانے کے تمام جال رکھتا ہے، وہ خود کو خانہ بدوش رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ تباہی سے محبت کرتے ہیں کیونکہ یہ چھلکا اتارنے کا عمل ہے۔ یہ انھیں یقین دلاتا ہے کہ وہ سچائی کے راستے پر ہیں۔ ہر شے جو افق کی راہ میں حائل ہے، ان کے اوپر بوجھ بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ درخت بھی۔ وہ انھیں ہٹا دیتے ہیں تاکہ وہ آگے تک دیکھ سکیں، یعنی کچھ نہ دیکھ سکیں۔ وہ اپنے جسموں کو فولاد کے بنے ہتھیاروں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

وہ شور سے محبت کرتے ہیں۔ وہ شورش سے محبت کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو کسی سوچ بچار یا طویل کشمکش میں مبتلا نہیں ہونے دیتے۔ ان کا کام اندھا دھند موت کی طرف بھاگنا ہے۔

تکلیف بھی ان کا بوجھ ہے۔ کسی اور کی تکلیف ظاہر ہے، وہ انھیں چھو کر بھی نہیں گزرے گی۔ ان کا رحم اگر کبھی ہوتا ہے تو قبائلی ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے شبہ ہی ہے کہ میری روز اس مقابلے سے زندہ واپس جا سکے گی۔

۱

آج کوئی عام اسکول کا دن نہیں ہے۔ مس میری روزان تین آدمیوں کے سامنے بیٹھی ہیں جن کے پاس رائفلوں سے زیادہ بڑی بندوقیں ہیں۔ یہ بندوقیں خوبصورت ہیں، بہت طاقتور...... ہم تو انھیں استعمال کرنے کے لئے بہت چھوٹے ہیں۔ لیکن چند سابقہ طلبا جو جنگ میں شامل ہیں حالانکہ وہ گونگے بہرے ہیں۔ انھیں پشتوں پر رکھا جاتا ہے، بڑی بڑی ریت کی بوریوں کے پیچھے، اور وہ سڑکوں کا دفاع کرتے ہیں، وہ گولیاں چلاتے ہیں، وہ ایک سکوت میں جسموں کو گرتے دیکھے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم خواب دیکھتے ہیں۔ اس دنیا میں ذرا بھی شور نہیں ہے۔ اسی لئے جنگ ختم نہیں ہوتی۔ کوئی اسے ختم کرنا نہیں چاہتا۔

دور دراز، بڑی طاقتیں بہت مصروف ہیں اور مزید یہ کہ وہ ہمارے بارے میں کبھی نہیں سوچتیں۔ اس لئے ہم جنگ بس جاری رکھتے ہیں سکوت کے عالم میں۔ خلیج سے بحرِ اوقیانوس تک، ہمارے جغرافیائی نقشوں میں، عرب سب خاموش ہیں۔ ملیشیا کے لوگ سمجھتے ہیں سوائے ایک عظیم صحرا کے یہاں اور کچھ نہیں۔ یہ یقیناً سچ ہے ورنہ لوگ ان لڑنے والوں کو ضرور بتاتے کہ انھیں نہیں لڑنا چاہیئے اور یہ کہ سڑکیں اک قصائی کی دکان کے فرش کی طرح خون سے رنگی ہوئی ہیں۔ ہر اتوار کو پہاڑوں میں وہ ایک بھیڑ کا سر کاٹتے ہیں۔ عین سڑک

پر، اس کی انتڑیاں نکالتے ہیں اور بعد میں اس کی کلیجی کھاتے ہیں۔ اس سے سڑک پر ایک چھوٹی سی گندی نہر سی بن جاتی ہے۔ اب وہ یہی کام مسلمانوں اور فلسطینیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان اور فلسطینی بھی عیسائیوں کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے، ہم ایک بھیڑ کا سر کاٹنے کے لئے تو بہت چھوٹے ہیں، مگر دو سال پہلے ہم نے مرغیوں کے سر کاٹنا سیکھا تھا۔ مرغیاں چاروں طرف چھلانگیں لگا رہی تھیں اور یہ واقعی گندہ کام تھا۔ ہمارے اوپر ان کے پر ہی پر لگ گئے تھے اور منہ تک میں خون گھس گیا تھا۔ مس میری روز آئیں اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہم مزید مرغیوں کے ساتھ تماشے میں مصروف ہوں۔ حالانکہ مرغیوں کو کیسے ذبح کرتے ہیں، یہ جاننا کارآمد بات ہے۔ لیکن وہ ہمارے چاقو لے گئے اور اب واپس نہیں دیتے۔

ہم سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ ہمارے والدین ہمیں مارتے ہیں۔ ہمارا گونگا بہرا ہونا انھیں بہت کھٹکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بے کار ہیں۔ ہماری وجہ سے ہماری بہنوں کی اچھی شادیاں نہیں ہوئیں۔ چنانچہ وہ ہمیں اس اسکول میں بھیج دیتے ہیں اور صرف مس میری روز ہم سے محبت کرتی ہیں۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کیونکہ وہ اتنی صابر ہیں۔ کلاس ختم ہونے پر وہ دوسرے اساتذہ کی طرح باہر نہیں بھاگتیں۔ وہ ہمیں اپنے دفتر آنے دیتی ہیں جب بھی ہمیں کوئی بات کرنا ہوتی ہے اور وہ ہمیں کبھی نہیں مارتیں۔

سال میں دو دفعہ ہمیں فلمیں دکھانے لے جاتی ہیں۔ پچھلی دفعہ ہم نے ایک مصری فلم ''چڑیاں'' دیکھی۔ فلم میں لوگ مختلف تھے۔ وہ سارا وقت مسکرا اور ہنس رہے تھے۔ وہ خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ ایسے نہیں لگ رہے تھے جیسے ہمارے ہمسائے میں لوگ آج کل نظر آتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ عام لوگوں میں شامل ہونے کے لئے فلم کے لوگوں کی طرح ہونا چاہئے۔ بہت سے مسکراتے ہوئے لوگ۔ جب ہم بڑے ہوں گے ہم بھی لوگوں میں شامل ہوں گے اور یہ صرف اس لئے نہیں کہ ہم غریب ہیں۔ ہم سب غریب نہیں ہیں۔ عام لوگوں

میں شامل ہونے کے لئے صرف غریب ہونا کافی نہیں ہے۔ آپ کو فرمانبردار اور معصوم ہونا چاہئے۔ آپ کو چیزوں کا جزو ہونا چاہئے جس طرح بادل آسمان کا حصہ ہیں۔

آج مس میری روز خوش نہیں ہیں۔ ان کی آنکھیں تاریک ہو رہی ہیں جیسے گرمیوں کی شام میں کوئی وادی۔ ان لوگوں نے انھیں اپنے سامنے بٹھالیا ہے اور اب وہ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ مجسموں کی طرح سخت ہیں۔ انھوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم باہر نہیں جا سکتے۔ کیا ان لوگوں کو سزا دی جا رہی ہے؟ انھوں نے کوئی واقعی خراب کام کیا ہوگا۔ جب ہی وہ ان کو اتنی سخت نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ گرجے میں معصوم مریم کے مجسمے کی طرح لگ رہی ہیں۔ بڑے والا مجسمہ جو ہمیں عبادت کے دوران میں گھورتا رہتا ہے۔ وہ جب غصے میں ہوتی ہیں تو ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ لیکن ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ ہم ان سے ڈرتے نہیں ہیں اور وہ ہم سے محبت کرتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سمندر پر افق۔

۲

مجھے کوئی خوش گمانیاں نہیں ہیں۔ میں ان کے جال میں پھنس گئی ہوں اور وہ ایک غیر مسلح شخص کے سامنے مسلح آدمیوں کی ساری ناشائستگی لئے یہاں موجود ہیں۔ ان کے پاس مکمل طاقت ہے جو ان کی بندوقوں کی طرح سرد ہے۔ میں ان کی ٹامی بندوقوں سے بات کرنے کو ترجیح دوں گی۔ وہ میرے لئے کم ناگوار ہوں گی۔

اس طرح یہاں مجھے دوبارہ منیر سے ملنا پڑا۔ جوانی ہی میں وہ دنیا پرست تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ اسے حریل نہ سمجھ لیا جائے۔ اسے جنون کی حد تک ناکامی کا خوف تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے دوسروں میں وہ خوبیاں دیکھی ہیں جو دراصل ان کے پاس نہیں ہیں اور اس بصیرت نے اسے پاگل کر ڈالا۔ وہ بہرحال انتہائی حساس تھا۔ اسے موسیقی اور ہر قسم کی دلفریب انوکھی باتوں سے محبت تھی۔ مثلاً وہ موسیقی صرف باغ میں سنا کرتا تھا۔ ریکارڈ پلیئر کو وہ کھڑکی کے قریب لے آتا اور پھر شوپاں اتیود (Chopin Etudes) کو ایک درخت کے نیچے خوبصورت بارش میں کھڑے ہو کر سنتا۔ میں اس کا مذاق اڑاتی تھی، اسے چھیڑتی تھی۔ وہ کہتا تھا: ''تم عرب موسیقی پسند کرتی ہو۔ تم اُمِ کلثوم کو پسند کرتی ہو کیونکہ تم عبدالناصر کو پسند کرتی ہو۔ وہ ایک جیسے ہیں۔''

وہ اپنے دوستوں سے مختلف تھا۔ وہ ان میں واحد تھا جو شام سے محبت کرتا تھا۔ وہ شکار کے لئے وہاں جانے کے خواب دیکھتا تھا۔ جبکہ دوسرے یقین رکھتے تھے کہ اگر کوئی یورپیوں سے مشابہ نہیں ہے تو وہ کچھ بھی نہیں۔ وہ ایشیا کے ایک سحر انگیز برِاعظم کی طرح بات کرتا تھا۔ جس سے مجھے خیال آتا تھا کہ جب میں بہت زیادہ پڑھ چکی ہوں گی تو مجھے پتا چل جائے گا کہ وہ تاریخ کے کون سے ہیرو سے مشابہت رکھتا ہے۔ ایشیا نے اس کے گرد ایک حلقۂ نور بنا رکھا تھا، اس کے بالوں سے کچھ ملتا جلتا۔ حالانکہ بالاخر اس کے دوستوں نے اس پر اثرات ڈالے اور وہ بھی عرب سنیما اور ہر اس شے کا جو اس علاقے سے تعلق رکھتی تھی، مذاق اڑانے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں عیسائی پڑھاتے تھے جو ان کے ذہنوں کا رخ پیرس اور فرانسیسی بادشاہوں کے جھگڑوں کی سمت موڑ دیتے تھے۔

یہ نوجوان لڑکے صلیبی جنگوں سے سرفراز ہوتے تھے۔ منیر اپنے آپ کو فریڈرک باربروسا سمجھتا تھا کیونکہ اس کے بال بھی کچھ سرخ تھے۔ وہ نہایت تلخی کے ساتھ افسوس کرتا تھا، جیسا کہ حال ہی میں صلاح الدین نے یروشلم فتح کیا ہو۔ یہ اس کے لئے ایک حقیقی تکلیف کا سبب تھا۔ صلیبی جنگیں ان سب کو جوش دلاتی تھیں۔ ہر سال فرانسیسی پادری ایک جلوس نکالتے تھے جس میں عیسائی اسکولوں کے تمام طلبا سفید کوٹ پہنے ہوتے تھے جن پر آگے پیچھے سرخ صلیبی نشان سلے ہوتے تھے۔ اپنے سروں پر وہ کفیہ وعقال پہنے ہوتے تھے جس سے وہ صلیبی جنگوں کے سپاہی کم اور عرب زیادہ نظر آنے لگتے تھے۔ وہ بیروت کی سڑکوں پر پام کی شاخیں لیے گاتے ہوئے چلتے تھے: ”میں عیسائی ہوں۔ یہ میری عظمت ہے، میری امید ہے، میرا سہارا ہے۔“ اگلے دن اسکول میں وہ کافروں کو شکست دینے پر مغرور نظر آتے تھے۔ وہ خود اور سخت جوتے پہنے ہوئے عیسائیت کا خواب دیکھتے تھے، ہتھیاروں کے ٹکراؤ میں اپنے گھوڑے دوڑاتی ہوئی، مسلمان پیدل سپاہیوں کو نیزے مارتی ہوئی، متعدد شعلے اگلتے اژدہوں کے ساتھ کئی عدد سینٹ جارجز کی طرح۔

منیر نے فرانسیسی اسکول جانے کے لئے عیسائی اسکول کو خیر باد کہا۔ مجھے یاد ہے میں نے اسے بتایا تھا کہ صلیبی سپاہی کا لباس پہنے، جلوس میں مارچ کرتا ہوا، وہ دنیا کی مضحکہ خیز ترین چیز رہا ہوگا۔ وہ ہنسا اور اس کی ہنسی آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ ''تم صرف ایک لڑکی ہو۔ تمھیں نہیں معلوم ایک بارہ سالہ لڑکا ہونے کا کیا مطلب ہے۔'' مجھے یاد ہے میں نے جواب دیا: ''تمھارا تعلق یہاں سے ہے۔ تم غیر ملکی نہیں ہو۔ تم کوئی فرانس یا انگلینڈ سے نہیں آئے ہو۔ تم کبھی صلیبی سپاہی نہیں ہو سکتے۔''

''تمھیں یقین ہے؟'' اس نے ایک اداسی کے ساتھ پوچھا جس نے اس کی آنکھیں دھندلا دی تھیں۔ ''تو پھر میں کیا بنوں گا؟''

یہ آدمی جواب میرے لئے اتنا اجنبی ہے اور اتنا دشمن، کیوں مجھے اتنا پیچھے لے جا رہا ہے اور ان نہتا کر دینے والے تصورات کو زندہ کر رہا ہے؟ کیا وہ آغازِ شباب کا سوال مجھے دوبارہ سننا ہے۔ ''کیا تمھارے اندر اتنی اچھی خوشبو ہے جتنا تمھارے نام سے ظاہر ہوتا ہے؟'' جس کے بارے میں، میں نے اس سے کہا تھا: ''یہ احمقانہ بات ہے!'' اور جو میں کبھی نہیں بھولی؟ کیا موت اتنی قریب ہے کہ وہ ماضی کو اتنا واضح طور پر ابھار رہی ہے کہ وہ حال کو اوجھل کر دے؟ میں اس ایک دن کو چابک کے وار کی طرح کیسے نہ محسوس کروں جب خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ ملاتے ہوئے، ہمارے ہاتھ جڑ گئے تھے اور ہماری رگوں میں ایک گرم خون کی برقی رو دوڑ گئی تھی؟ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہے اور میں اپنی اور اس کی انگلیوں میں، یا اپنی اور اس کی سانسوں میں، تمیز نہ کر سکی۔ اس نے اپنے ہونٹ میرے بالوں پر رکھے اور دوڑتا ہوا چلا گیا۔ میں گلیوں میں پھرتی رہی، ساحل پر گھومنے چلی گئی اور تقریباً اندھیرا ہو رہا تھا جب آسمان کو دیکھ کر، میں گھر واپس آئی۔ میں اپنی ماں سے بات کرنے سے بچتی رہی، اس کی آنکھوں سے بچتی رہی۔ بیماری کا بہانہ کیا اور بستر میں، ان سرد چادروں میں گھس گئی جہاں میں صبح تک اپنی مٹھیاں اور آنسو بند کیے سوتی رہی۔

یہ میری زندگی کی واحد رات تھی جب میں مکمل مایوس ہو کر سوئی، ایک مسافر کی طرح۔

بچے بے چین ہو رہے ہیں۔ وہ باہر جانا چاہتے ہیں لیکن فواد انھیں بتاتا ہے کہ وہ خاموش رہیں اور دیکھیں کہ غداروں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

میں، ایک غدار؟ کس سے؟ کیا کیا میں نے؟

بیس سال کی عمر میں میری شادی ہوئی۔ کیا اذیت دہ اور کتنے پُر غم تھے شادی کے وہ اولین سال! ہر شے میرے اطراف میں سکڑ گئی تھی۔ چیزیں بھی، میرے پھیپھڑوں میں ہوا بھی۔ میں بوریت کے ایک دائرے میں داخل ہو گئی تھی۔ ایک غیر حقیقی سکون میں، ہمسایوں سے ملاقات کی نیم خوابیدگی میں۔ میری آرام کرسیوں سے، میری ماں کی آرام کرسیوں جیسی خوشبو نکلنے لگی تھی۔ پھر میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرا شوہر اینٹھ گیا، پھر غصہ کرنے لگا اور آخر کار نفرت ہمارے درمیان آ گئی۔ اس نے مجھ سے شدت کے ساتھ نفرت کی۔ میں نے ان مرئی اور غیر مرئی قوتوں سے مقابلہ جاری رکھا جو میری مزاحم تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو ایک عوامی زندگی میں ڈال دیا، کانفرنسوں، سماجی عمل، منصوبہ بندی کی کمیٹیوں کے چکر میں۔ مختلف النوع مقاصد، میرا دماغ اس سیارے کی طرح جھول رہا تھا جو بالآخر اپنے دائرۂ کشش سے آزاد ہو گیا تھا، اور پھر میرے اپنے بچے۔ بچوں کا ہونا بھی کیا اچھی بات ہے۔

ہاں میرے بچے، میرے تین بچے میرا انتظار کر رہے ہیں اور جب وہ مجھے آتا ہوا نہیں دیکھیں گے، وہ پریشان ہونا شروع کر دیں گے۔ وہ پہلے ہی ہر محلے میں جاری ان لڑائیوں سے دہشت زدہ ہیں۔ انھوں نے لوگوں کو گولیاں چلاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے سڑکوں پر لاشیں دیکھی ہیں اور غور سے ان کا معائنہ کیا ہے جبکہ ماضی میں، میں انھیں ایک مردہ چوہے کو بھی نہیں دیکھنے دیتی تھی۔ انھوں نے اک تلخ شیرینی لیے، سڑے ہوئے متعفن گوشت کی گرم بو میں جو کہ ہوا ایک گھر سے دوسرے کو لے جاتی ہے، سانس لی ہے اور اب بھی لے

رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ہزار مرتبہ مجھے اپنے دوست کی کہانی سنائی ہے جو تیرنے کے لئے قزائی ساحل پر گیا تھا اور جب وہ پانی سے نکل رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے مخنے گلے ہوئے گوشت نے جکڑ لیے ہیں جس سے اس نے قے کرنا شروع کر دی اور اپنے تہہ شدہ کپڑے اسی طرح ہاتھ میں لیے بھاگنے لگا۔ انھیں معلوم ہے کہ لوگ ایمبولینسوں پر گولیاں چلاتے ہیں اور آگ بجھانے والوں کو مار دیتے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کو یہ بتاتے ہوئے سنتے ہیں کہ انتڑیاں اور آنکھیں کیسے نکالی جائیں۔ وہ ان عیسائیوں کے بارے میں سنتے ہیں جن کو مورچوں سے نکالا گیا، ان کے اعضائے تناسل کاٹ دیئے گئے، کلہاڑیوں سے ٹکڑے کیا گیا اور کوڑے کے ڈبوں میں پھینک دیا گیا۔ لوگ مسلمانوں کو پکڑنے کے لئے، گھسیٹنے کے لئے، چار ٹکروں میں تقسیم کرنے کے لئے اور اذیت ناک چیخوں کے ساتھ انھیں مرتا ہوا دیکھنے کے لئے دفتروں میں گھس گئے ہیں۔ مجھے اپنے بچوں کو اس بات کا قائل کرنے میں کہ یہ سب کچھ گھناؤنا ہے، دشواری ہوتی ہے۔

وہ صرف ایک بات کے بارے میں سوچتے ہیں، بڑے ہونا اور لڑنا۔ اور جب میں انھیں بتاتی ہوں کہ یہ سب مکمل شر ہے، وہ مجھے بتاتے ہیں کہ انجیل میں لکھا ہے کہ خدا دشمن سے نفرت کرتا ہے۔ اور جب میں پوچھتی ہوں خدا کہاں ہے اور دشمن کون ہے، وہ مجھے چومتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے، میرے سینے سے چمٹ جاتے ہیں۔

میں نے کیا کیا؟ جون ۶۷ء کی شکست کے بعد، میں نے ''ایسوسی ایشن آف دی فرینڈز آف یروشلم'' بنائی۔ میں نے سوچا کہ اس ملک میں جہاں کہ عیسائی اقتدار میں ہیں، بہت سے لوگ اس شہرِ مقدس کو کھو کر، اپنے آپ کو اکیلا محسوس کریں گے۔ لیکن اس شہر میں یروشلم کے دوست نہیں ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس احساسِ محرومی کو فلسطینی پناہ گزینوں کی مادی امداد سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہم محض چند خواتین تھیں جو پوسٹرز لگا رہی تھیں، اخباروں کو وہ خطوط لکھ رہی تھیں جو شاذ و نادر ہی چھپتے تھے، فنڈز جمع کر رہی تھیں، غیر ملکی سفارت خانوں

میں جاری تھیں تاکہ عوام کو اس ذہنی اور مادی تکلیف سے آگاہ کیا جا سکے جس کا کیمپوں میں دور دورہ تھا۔ انھوں نے ہم سے پاگل عورتوں جیسا سلوک کیا۔ ان کے لئے فلسطین ایک غیر حقیقی دیو مالائی داستان تھا۔ فلسطینیوں کے لئے بھی شروع میں ہم اجنبیوں سے زیادہ نہیں تھے۔ لیکن ہم نے انہیں جیت لیا۔ وہاں جانا ایک غیر ملکی علاقے کا دورہ کرنے کے مانند تھا۔

ہماری اور ان کی دنیاؤں کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں مگر وہ ایک دوسرے کو چھوتی نہیں تھیں۔ انھوں نے ایک جزیرہ بنایا جہاں انتقام کے جذبات جنگل میں بانس کی طرح پروان چڑھے۔ ان کے کیمپوں کی تنگ گلیوں میں ایک رزمیے کی شاخیں پھیل رہی تھیں۔ ان کی پناہ گاہوں نے جو فلمی تھیٹروں کی طرح مرطوب تھیں، ہتھیاروں کو چھپا رکھا تھا جو ہمارے وہ چھوٹے، لکڑی کے بنے ہوئے، بغیر تالوں کے دروازے کھولتے ہی چمکنے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آپ ان کے جامد خیالات پڑھ سکتے تھے۔ نعرے اور بے صبری ان کے دہانوں میں جمع ہو جاتی تھی۔ کھانا باہر پکایا جاتا تھا۔ ایک ضرورت کی طرح یہ بہت بے زارکن ہوتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی گانا شروع کر دیتا جو ہمیشہ ایسی کراہوں پر ختم ہوتا جیسی ساحل سے اس وقت نکلتی ہیں جب سمندر اسے زور زور سے پیٹ رہا ہو۔ میں کیمپ کے پاگل خانے گئی جو بیروت اور ہوائی اڈے کے درمیان واقع ہے۔

نچلی منزل پر ایک کھڑکی تھی جس پر بچے اپنا دل بہلانے کے لئے چڑھتے تھے۔ تین دن قبل ایک بم اس کمرے کے قریب گرا۔ وہ میرا اس کیمپ کا آخری دورہ تھا۔ تین نوجوان گری ہوئی دیوار کی جگہ نگرانی کا کام انجام دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے جسے مسلسل غم نے سرد کر دیا تھا، مجھ سے کہا: ''ہم جانتے ہیں جب یہ ناقابلِ برداشت ہونے لگے گا، ہم پاگل ہو جائیں گے۔ مگر وہ! وہ تو پہلے ہی سے پاگل ہیں۔ ان کی منزل کیا ہوگی؟''

صلیبی جنگ جسے میں ہمیشہ ناممکن خیال کرتی تھی، دراصل حقیقت بن گئی ہے مگر یہ حقیقت میں مذہبی نہیں ہے۔ یہ غریبوں کے خلاف ایک زیادہ بڑی صلیبی جنگ کا حصہ ہے۔

وہ مفلسوں کے علاقوں میں بمباری کرتے ہیں کیونکہ وہ انھیں ایسے کیڑے سمجھتے ہیں جو ان کے خیال میں انھیں کھا جائیں گے۔ وہ ان لوگوں کا دھار اروکنے کے لئے لڑتے ہیں جو اپنا سب کچھ کھو چکے ہیں یا جن کے پاس کبھی کچھ تھا ہی نہیں اور جن کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے درمیان جو غریب تھے، انھیں ''دوسروں کے'' غریبوں کے مرکز سے گمراہ کر دیا ہے۔

یروشلم ایک عظیم غیر موجود ہے۔ وہ شہر جس کی چند ہزار سال قبل کنعانیوں نے بنیاد رکھی۔ ان کے اجداد، جہاں یسوع مسیح کی موت ہوئی اور وہ اٹھا، وہاں کبھی نہیں گئے۔ وہ وہاں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ روحانی یروشلم مر چکا ہے۔ ان کے قبائلی اتحاد سے اور ان کی نفرت کے بوجھ تلے۔ یہ اب مشرق وسطیٰ میں نہیں ہے۔

۳

میری روز! تم میرے سامنے کھڑی ہو۔ تم اتنی دُور سے میرے پاس واپس کیوں آئیں؟ اور ایک ایسے لمحے؟ میں نے ملیشیا میں شامل ہونے سے پہلے، کئی ماہ انتظار کیا۔ میں جھجک رہا تھا مگر پھر وہ وقت آ گیا کہ میں اپنے دوستوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ہر رات وہ میرے گھر آتے تھے اور مجھے بتاتے تھے کہ سپاہیوں کو لڑنا آتا ہے مگران کے پاس ایسے آدمیوں کے عملے کا فقدان ہے جو تنظیم کرنا جانتے ہوں۔ وہ چھوٹے ہتھیاروں اور اپنے غیر معمولی حوصلے کے علاوہ ہر شے کے بغیر گھر گھر لڑ رہے ہیں۔ ان کی بمباریاں بغیر کسی خاص نشانے کے ہوتی ہیں۔ ابھی مجھے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا کہ میں نے بالآخر اپنے آپ کو اس معرکے میں ڈال دیا اور اب تم ایک ماضی بعید سے نکل کر، اتنے خوفناک فیصلے کو میرے سامنے لئے آ گئی ہو۔

میں یقیناً خواب دیکھ رہا ہوں۔ سولہ سال نہیں گزرے ہیں اس وقت کو جب میں نے اپنا پہلا جوان بوسہ تمھارے بالوں میں چھوڑا تھا۔ ہم دونوں سولہ سال کے تھے اس وقت۔ میں گھر گیا۔ اپنے آغازِ شباب کے کمرے میں پہنچا جہاں محبت کے بجائے کھیلوں کی ٹرافیاں

جمع تھیں۔ بیروت میں اگست سے زیادہ گرم خواہش میرے خون کو بھڑکا رہی تھی۔ اور متعدد بار مُسٹر بیشن کے بعد، مجھے لذت کے اس درجے کا احساس ہوا جو میں نے اس سے پہلے حاصل نہیں کیا تھا۔ اس رات میری ماں بے چین تھیں اور اکثر مجھے پکارتی تھیں: ''منیر!'' انھوں نے اپنے کمرے سے کہا: ''تمھیں کچھ چاہئے؟'' اور میں نے تمھارے ساتھ تنہا ہونے کے لئے ان کی آواز کو اَن سنا کر دیا۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ یہ یادِ ماضی جو تم میرے اندر جگا رہی ہو، میرے لئے خود سے نفرت کا ایک اور سبب بن جائے گی اور میری روح میں ایک اور عذاب کا اضافہ ہو جائے گا۔

''مجھے تم سے کچھ سوال کرنا ہیں۔''

''کون سے سوال ہیں؟''

''تم دشمن کی طرف گئیں تھیں؟''

''کون دشمن؟''

''فلسطینی۔ تمھارا شمار فلسطینی مزاحمتی گروہوں میں ہوتا ہے۔ تم ہمارے خلاف لڑ رہی ہو۔''

''میں مزاحمتی فوج کے لئے سماجی خدمات اس سے، جنھیں آپ حادثات کہتے ہیں، بہت پہلے سے کر رہی تھی اور میں نے اپنا کام جاری رکھا ہے۔''

''آج کل ان کے لئے کام کرنا غداری ہے۔''

''میں فلسطینیوں کو دشمن نہیں سمجھتی۔ وہ اپنے اجداد کی وراثت سے تعلق رکھتے ہیں جن سے عیسائی پارٹی کا تعلق ہے۔ وہ دراصل ہمارے بھائی ہیں۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ حملے کے وقت وہ اللہ اکبر چیختے ہیں؟''

''اور صلیبی نشان جو آپ پہنتے ہیں۔ کیا وہ اسی خدا کی اطاعت کی علامت نہیں ہیں اور اس لئے ایک قسم کا جنگی نعرہ؟''

''ان کی ہمارے ملک میں موجودگی ایک مستقل باعث اشتعال رہی ہے۔''

''کیونکہ وہ غیر محفوظ زمین پر تھے۔ کسی نے ان کے شاعروں کو مار دیا، جب آپ شکار میں مصروف تھے۔ کسی نے ان کے سیاسی رہنماؤں کو نیند میں مار دیا، جب آپ مائی کارلو میں کاروں کی ریلی یا اطالوی گرینڈ پری کی نقل کرتے ہوئے، پہاڑی راستوں پر جنگلیوں کی طرح گاڑیاں چلا رہے تھے۔ کسی نے ان کے کیمپوں پر بمباری کی، جب آپ باہر رقص میں مگن تھے۔ اقوام متحدہ کے ایوانوں میں لوگوں نے ان کی تاریخ کی سودے بازی کی، جب آپ خفیہ طور پر ان کے حملہ آوروں کے امدادی ہتھیاروں سے خود کو مسلح کر رہے تھے تا کہ ایک دن آپ انھیں ان کی پشت میں گھونپ سکیں۔''

لیکن یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم یہاں بالکل مطمئن ہیں۔''

''اور مطمئن ہونا اخلاقیات سے بڑھ کر کب سے ہو گیا؟''

''کیا اخلاقیات؟ میں صرف حکومت کی طاقت کو مانتا ہوں، اس وقت بھی جب کہ اس کی بنیاد تشدد کے علاوہ کسی شے پر نہ ہو۔ یہ تشدد ہی ہے جو کسی قوم کی ترقی کی رفتار تیز تر کرتا ہے۔''

''اخلاق ایک تشدد ہے۔ ابتدا میں ایک ناقابلِ دید تشدد! محبت ایک عظیم ترین تشدد ہے، ہمارے ذرات کی تاریک گہرائی میں چھپا ہوا۔ جب کوئی نہر دریا میں گرتی ہے یہ محبت ہے اور ایک تشدد۔ جب ایک بادل اپنے آپ کو آسمان میں گم کر دیتا ہے یہ ایک عقد ہے۔ جب ایک درخت کی جڑ ایک چٹان کو کھول دیتی ہے یہ زندگی کی حرکت ہے۔ جب سمندر چڑھتا ہے اور صرف دوبارہ چڑھنے کے لئے اتر جاتا ہے یہ تاریخ کا عمل ہے۔ جب ایک مرد اور عورت رات کی تنہائی میں اک دوسرے کو دریافت کرتے ہیں یہ قبیلے کی طاقت کے خاتمے کی ابتدا ہے۔ اور موت خود گروہ کے غلبے کے لئے للکار بن جاتی ہے۔''

''کیا تم واقعی فلسطینیوں سے محبت کرتی ہوں؟''

''میں نے ان ہزاروں مردوں اور عورتوں سے محبت کی ہے جو چوہوں کی طرح اک جہاز کو چھوڑ کر بھاگے جس پر زیادہ طاقت ور چوہوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ان برسوں کے دوران میں جب وہ ان کیمپوں میں رہنے پر رضا مند ہو گئے جہاں ہم نے ان کو رکھا، ان سے بزدلوں کا سا سلوک کیا گیا۔ جب انھوں نے بالآخر اپنے آپ کو منظم کیا جو کہ انھیں اپنے علاقے سے باہر کرنا ہی تھا، تو تمام عرب ریاستوں نے انھیں کچلنے کے لئے اتحاد کر لیا اور آپ بھی ان کے فیصلے کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ آپ کا خیال ہے آپ ایک آزادانہ عمل کر رہے ہیں لیکن دراصل آپ کو استعمال کیا جا رہا ہے۔''

''تم ان کی نخوت سے انکار کرتی ہو؟''

''اور آپ کی اپنی نخوت؟ حالانکہ یہ سچ ہے کہ آپ صرف بڑی طاقتوں کے منصوبوں پر عمل پیرا ہیں کہ ان لوگوں کو جو پہلے ہی ذلت اٹھا رہے ہیں، مزید ذلیل کیا جائے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔''

''میری روز یہ تم ہو جس کے بارے میں فیصلہ کیا جا رہا ہے، ہم نہیں۔''

''اور کیوں نہیں؟ کون مجھے روکے گا اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے جب کہ شاید یہ میرا آخری موقع ہے۔''

''یہ تمھارا آخری موقع نہیں ہے۔ ہم سب یہاں عیسائی ہیں۔ اس سے بہت فرق پڑے گا اگر تم تھوڑے پچھتاوے کا تھوڑے شبے کا اظہار کرو۔''

''میں تین بچوں کی ماں ہوں۔ میں نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا۔ میں ایک نوجوان فلسطینی کے ساتھ رہتی ہوں جو اس لمحے خطرے میں ہے۔ میں اسے جاننے سے قبل بھی فلسطینی نصب العین کے ساتھ تھی۔ میں ان کی اور اپنی مشترکہ تہذیب، مشترکہ تاریخ کی حفاظت کر رہی ہوں۔ میں کوئی فرق نہیں دیکھتی۔ لیکن اگر آپ کے خلاف ہونے کی تکلیف کے ساتھ میں نے ان کا ساتھ دیا ہے تو وہ اس لئے کہ ہماری بقا کا انحصار ان کی بقا پر ہے۔''

''میں قانون کی نمائندگی کرتا ہوں۔''

''وہ ایک نئے آغاز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عرب دنیا جگہ کے لحاظ سے لامحدود حد تک وسیع ہے اور بصارت میں لامحدود حد تک تنگ۔ یہ فرقوں اور ذیلی فرقوں، اقلیتی آبادیوں اور گروہوں سے مل کر بنی ہے جو حسد کے مارے، سڑے ہوئے اور کیڑوں کی طرح اپنے اندر مقفل ہیں۔ اس دنیا کو کچھ ہوا دینا چاہیے، اس کی کرختگی کو نرم کرنا چاہیے۔ پہلی دفعہ مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں فلسطینیوں کی آوارگی ایک خانہ بدوش کی سی نہیں ہے جو اپنا قبیلہ اپنے اندر لیے گھوم رہا ہو، بلکہ ایک اکیلے، اکھڑے ہوئے اور مظلوم آدمی کی آوارگی ہے۔

''وہ آپ کی قدروں کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس عمل میں اپنی گردنیں توڑ رہے ہیں۔ وہ آپ کے اور آپ کے بددیانت حلیفوں کے ہاتھوں اپنی گردنیں کٹوا رہے ہیں، آپ کو آزاد کرنے کے لیے! بہت سی گرہیں ہیں جنھیں کھولنا ہے، پھوڑے ہیں جنھیں خشک کرنا ہے۔

''اس کے علاوہ چیزیں پہلے ہی بے نقاب ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اب اس میں دیر ہو چکی ہے کہ آپ ماضی کے خول میں رینگ سکیں۔ مردہ فلسطینیوں کے خون میں ملا ہوا اتنا ہی لبنانیوں کا خون ہے جو ان کے لئے اور ان کے ساتھ مارے گئے۔ پہلی دفعہ عربوں کی تاریخ میں ایک گروہ نے دوسرے کے لئے جان دی ہے۔ آپ ملک کے آدھے حصے کی نمائندگی نہیں کرتے جس میں اتنے ہی عیسائی ہیں جتنے کہ مسلمان ہیں جو فلسطینیوں کے لئے اور ان کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ میں اکیلی نہیں ہوں جو یہ کر رہی ہوں۔

''آپ جو فتح سے اتنی محبت کرتے ہیں، خبردار رہیں کہ فلسطینیوں کی شکست عرب نفسیات کے لئے خمیر کا کام کرے گی۔ آپ ان کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ میں دہراتی ہوں کہ آپ ان کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ میں ان کے مرنے کی کھڑکھڑاہٹ سن سکتی ہوں۔

ان کا خون آپ کے دہانوں کو بھرتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں حرکت میں ہیں۔ وہ رباط میں، الجیریا میں، تیروان میں، لیبیا کے ترپولی میں، فیوم اور دمشق میں، اور اس سے بہت آگے، ہر جگہ حرکت میں ہیں۔ لوگ ننگے پاؤں اپنے حقوق کا دعویٰ کرنے پہنچ رہے ہیں۔''

''اور تم؟ تم کس کی نمائندگی کرنے کے لئے ہو؟''

''میں محبت کی، نئے راستوں کی، نامعلوم کی، کبھی نہ آزمائے ہوئے کی نمائندگی کرتی ہوں۔ دس ہزار سال سے دنیا کے اس حصے میں، ہم قبائلی اور صرف قبائلی رہے ہیں۔ لیکن گلگامیش اکیلا ہی نکلا تھا، سارے بندھنوں کو توڑ کر، زندگی اور موت کی تلاش میں۔ اس روزِ بعید سے ہم نے ایک واحد آدمی بھی پیدا نہیں کیا جس نے کسی مذہب کی بنا نہ ڈالی ہو۔ ایک واحد آدمی بھی ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوا جو مؤثر انداز میں اکیلا ہو، جس نے اپنے طور پر خیر و شر کو سمجھنے کی جستجو کی ہو، جو کسی کے علم میں لائے بغیر صلیب پر چڑھ سکا ہو، جو اپنی مہم اور اپنے راز کو اک ایسی قبر تک لے گیا ہو جو کسی جنت یا جہنم پر نہ کھل رہی ہو۔ گڈریا یا بھیڑ، آپ نے اپنی شناخت ہمیشہ ریوڑ کے حوالے سے لی ہے۔''

''لیکن تم خود کو خوابوں اور قیاسات میں گم کر رہی ہو۔ تم ان کی نخوت کو بھول جاتی ہو۔ وہ ملکوں جیسا رویہ رکھتے ہیں۔ وہ دن کی پھیلی ہوئی روشنی میں اپنے ہتھیار لہراتے ہوئے پھرتے ہیں۔ وہ ہیں کہ جنھوں نے اکڑنا شروع کیا۔''

''آپ کے اور ان کے درمیان ایک غلط فہمی ہے جسے تاریخ معاف نہیں کرے گی۔ یہ ایک انقلاب کا سبب بنے گی۔''

''یہ جنگ ہے میری روز! تم اسے شہری جنگ کہو یا قبائلی، لیکن ہمارے ساتھی مر رہے ہیں۔ اگر کل عیسائیوں کا محاذ ٹوٹ جاتا ہے تو تمھارے فلسطینی ہمارے گھروں پر ٹوٹ پڑیں گے اور بیماری پر قتلِ عام ہوگا۔ اس کے علاوہ میں ریاست کی طاقت کا محافظ ہوں۔''

''تم نے ریاست کی طاقت پر زبردستی قبضہ کیا ہے۔ تم ایک ملیشیا ہو۔''

''ہم لوگوں کی خواہش کے نمائندہ ہیں۔''

''کچھ لوگوں کے۔ دوسرا حصہ۔ جو زیادہ بڑا ہے، فلسطینیوں کے ساتھ ہے۔ وہ ان کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔''

''پہلے ہم یہ جنگ جیتیں گے۔ اس کے بعد ہم بات کریں گے۔''

۴

کوئی اس ریت کو نہیں سمجھے گا۔ میری روز الزام عائد کرتی ہے۔ منیر پر الزام عائد ہوتا ہے۔ اسے اپنا منھ بھی نہیں کھولنا چاہئے۔ وہ یہاں اسے سننے کے لئے نہیں بیٹھا ہے۔

وہ جانتا ہے کہ وہ ایک مجرم ہے اور اس کے دماغ پر اتنی سؤر کی چربی چڑھی ہے کہ وہ بدلے گی نہیں۔ ایک ایسی عورت کی جو اپنے بارے میں سنجیدہ ہوتی ہے، اصلاح کرنے کی کوشش کرنا وقت کا زیاں ہے۔ اسے ایک فلسطینی کو دوست نہیں بنانا چاہیے تھا۔ اسے ہم بستری کے لئے اس سے بہتر کوئی مل سکتا تھا۔ اگر وہ میری بہن ہوتی، میں اسے بہت پہلے مار چکا ہوتا۔ میری اپنی بہن اچھی ہے۔ وہ بالکل دوسری قسم کی ہے۔ وہ ہماری ماں کے ساتھ باہر جانے کے علاوہ کبھی باہر نہیں نکلتی۔ جب آپ اس سے بات کریں تو وہ آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ لیکن جب اس جیسی کسبیاں جنگ میں دخل انداز ہو جائیں تو یہ ایسی بات ہے جس سے کراہت آنے لگے۔

۵

ٹونی اور میں بور ہو رہے ہیں۔ ہمیں اس قصے کو ختم کرنا چاہیے۔ عورتوں کا کوئی فقدان نہیں۔ تیس ہزار افراد میں ایک کی کمی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور اس کے علاوہ ہم قیدی رکھتے بھی نہیں۔ اس نے جو کچھ کہا، صرف یہ نہیں کہ وہ دوسری طرف چلی گئی۔ ایسے لوگ فلسطینی بننا چاہتے ہیں، بائیں بازو کے مسلمان، مجھے کیا معلوم؟ اور مزید یہ کہ وہ ہمارے ملک پر قبضہ کر رہے ہیں اور وہ ان کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا آپ دنیا کے کس ملک میں ہیں، ایک غدار تو غدار ہی ہوتا ہے اور یہ بچے مستقل باہر جانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ دیکھیں کہ غداروں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میری روز؟ اس نے انھیں سیدھے راستے پر چلایا۔ اس مس میری روز نے...... اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ انھیں سبق سیکھنا چاہیے تاکہ آئندہ بغاوت کا خیال بھی ان کے دماغ میں نہ آئے۔ آپ اس زمانے میں کچھ نہیں جانتے۔ گونگے بہرے بھی تخریب پسند بن سکتے ہیں۔

''تم نے آج صبح کچھ کھایا، میری روز؟''

''ہاں۔''

''میں نے، میں نے وہی کھایا جو ہمیشہ کھاتا ہوں۔ نابالغ بھیڑ کی کلیجی تھوڑے نمک کے ساتھ، آنتیں، بھیجا، ساری خاص چیزیں، تم سمجھتی ہو۔ اور تم نے اپنی کافی پی۔ ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں۔''

''میرا یہی خیال تھا۔''

٦

''اگر تم مسلمان ہوتیں، میری روز، تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ انھوں نے پہلی سڑک کے کنارے تمھیں گولی ماردی ہوتی۔ لیکن تم عیسائی ہواور ہم اب بھی تمھاری زندگی بچا سکے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''میری زندگی بچا سکے؟''

''ہاں۔''

''یہ دوطاقتوں کی جنگ ہے۔ دوطاقتوں اور دنیا کے بارے میں دونظریات کی۔ آپ نے اپنی صفوں کو بھرنے کے لئے، اصل معاملات کو چھپانے کے لئے، اسے مذہبی جنگ بنا دیا ہے۔''

''لیکن ان کی پشت پر اسلام ہے۔ اس لئے ہم اسلام سے جنگ کررہے ہیں، چاہے تمھیں اچھا لگے یا نہیں۔ وہ اپنے مذہب کو اپنی تہذیب سے، اپنے ورثے سے جدا نہیں کر سکتے اور نہ ہم کرسکتے ہیں۔ ہم اس راستے کے لئے لڑرہے ہیں جو خدائے مقدس کو جاتا ہے۔ بہترین راستہ۔''

''آپ اس راستے کے بارے میں فیصلہ کیسے صادر کرسکتے ہیں جو نہ آپ نے بنایا ہے

نہ اس پر سفر کیا ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ صحرا کے راستے آپ کے شہروں کے راستوں کے مقابلے میں خدائے مقدس کی سمت کم جاتے ہیں؟''

''تم ان بچوں سے ایسی باتیں کرتی ہو؟ تم ان کے دماغوں میں یہ خیالات ڈالتی ہو؟''

''یہ بچے، جیسا کہ آپ انہیں کہتے ہیں، یہ طلباء و طالبات گونگے اور بہرے ہیں۔ اس توہماتی معاشرے میں جہاں کمزوریاں شیطان کا کام خیال کی جاتی ہیں، ان کے لئے کبھی کوئی مقام نہیں ہوگا۔ آپ کو ان سے کبھی خوفزدہ نہیں ہونا پڑے گا۔ چمگادڑوں کی طرح یہ ہمیشہ تاریکی میں جکڑے رہیں گے۔''

''میں انصاف کا رکھوالا ہوں۔''

''جب ہر دوسری چیز تباہ ہو جائے تو محبت کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا اور آپ نہیں جانتے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔''

''تم عیسائی ہو اور تم دشمن کی طرف گئی تھیں۔ گروہ میں واپس آجاؤ۔ تم پہاڑوں کی اور پکتی ہوئی روٹیوں کی مہک سونگھو گی۔ یہ محبت کی ایک شکل ہے۔ ہم سب بہن بھائی ہیں۔ یہ سب اتنا اچھا اور پرسوز ہے۔''

''کیمپوں میں سردی ہے اور میں اسے ترجیح دوں گی، بونالیاس۔''

''کیا تمہیں جہنم میں جانے سے خوف نہیں آتا؟''

''تم نے پہلے ہی اس ملک کو جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔''

ے

مشرقی عرب کے کلیساؤں میں زمیں دوز قبرستان ہیں۔ ایمان ہے جو کہ ظاہر ہے، لیکن ابہام بھی ہے۔ وہ اب تک ایک تخیلاتی بت پرستی کی مخالفت میں اپنی شناخت ڈھونڈتے ہیں۔ انھوں نے اب تک بھول بھلیوں کو نہیں چھوڑا۔ ان کے پیٹ میں وہ منظیم اصلاحات کا چاقو کبھی نہیں لگا جو مغرب کے کلیسا کے لگا تھا۔ انھیں انسانی تکلیف سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دیومالائی عفریت کے علاوہ کسی قوت سے حقیقی ابلاغ نہیں کرتے۔ سینٹ جارج کی تلوار ہے جوان کے اعمال کی محرک ہوتی ہے۔

ان گرجوں کے مقابل اسلام ہے جو اکثر یہ فراموش کر دیتا ہے کہ وہ فضلِ خداوندی جس کا تذکرہ قرآن کی پہلی سورۃ میں ہوتا ہے، صرف انسانی رحم کی صورت میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ان کا باہمی قرب ایک خشک سیلاب ہے جو راستے میں پھولوں سے زیادہ لاشیں چھوڑتا ہے۔

یہ چار جوان مرد جو اس کلاس روم میں بیٹھے ہیں، صرف منصفین نہیں ہیں۔ وہ انسان کی اطاعتِ تقدیر کی بہت پرانی اور بہت لمبی روایت کے شکار ہیں۔ ان کے لئے گروہ کا فیصلہ وہ چیز ہے جس کا انھیں دفاع کرنا ہے اور کسی بھی طریقے سے اسے عمل میں لانا ہے۔ وہ

تمام وقت خود کو مصنفین گردانتے ہوئے آپ کو جلاد بننے کی تربیت دیتے ہیں۔

وہ ایک بیمار جنسیت، ایک دیوانی محبت سے متاثر ہوتے ہیں جس میں پامالی اور ماتم کے مناظر غالب ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہ خواہش کے باوجود عورتوں یا مردوں سے محروم ہیں بلکہ جنس سے اک گہری کراہت نے ان کا راستہ روکا ہوا ہے۔ خوشی میں ناپاکیزگی کا احساس انھیں اذیت پہنچاتا ہے اور کبھی انھیں مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ اس لئے عرب خود کو ایک چیرتے، پھاڑتے، قتل کرتے، نیست و نابود کرتے ہوئے تشدد میں مبتلا ہونے دیتے ہیں اور جب کہ دوسری قومیں جو خود بھی پاکیزگی کے خبط سے زہر آلود ہیں، کیمیائی مصنوعات ایجاد کرتی ہیں، وہ ایک قدیم طرز کی اور مکمل نسل کشی کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی جنگوں میں وہ زمین فتح کرنے کی نہیں بلکہ ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر وہ لاشوں کو مسخ کرنے پر مصر ہوتے ہیں تو وہ دشمن کے جسم کو مزید منہا کرنے کے لئے ہے اور اگر ممکن ہو تو اس حقیقت کو مٹا دینے کے لئے کہ کبھی اس کا وجود بھی تھا، دشمن کا وجود جو ایک طرح کی ناپاکی ہے، اتنی ہی بڑی طہارت کا تقاضا کرتا ہے۔

وہ اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے جو واپس قبیلے کی سمت لے جانے والے اندرونی راستے اور اس ضرورت کے درمیان ہے جو کوئی نئے آسمانوں کے نیچے محسوس کرتا ہے، رکاوٹوں کو توڑ ڈالنے کی اور آزاد بکریوں کی طرح اطراف میں نظر ڈالنے کی، بلا سوچے سمجھے اس انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کی یہ ضرورت، بدلتے ستاروں کی لے کے ساتھ حرکت کرتی ہے۔ یہ پہلی دفعہ نہیں ہے کہ ایک عرب عورت نے ان کے سامنے ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن ان کی یادیں بھی باغی ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے بجائے اپنی کاروں میں زیادہ خوبیاں دیکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں ان پر صرف بالواسطہ طاقت استعمال کرتی ہیں، ایسی طاقت جو غیر مؤثر نظر آتی ہے یا پھر اتنی شدید ہے کہ وہ ''مرد'' اسے پہچان نہیں سکتے۔ لیکن کوئی عورت جوان کے سامنے سر اٹھاتی ہے اور ان کی آنکھوں میں دیکھتی ہے، ایک درخت

ہے جسے کٹ جانا چاہیے اور وہ اسے کاٹ دیتے ہیں۔ وہ مردہ لکڑی کی سی آواز کے ساتھ گرتی ہے جو شہر کی قریبی بڑبڑاہٹوں اور ان عورتوں کے بناوٹی قہقہوں میں غائب ہو جاتی ہے جو مردانہ فتوحات سے مطمئن ہو جاتی ہیں۔

وہ اپنی ماؤں میں اچھی خصوصیات کا اعتراف کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ ان میں اور ان کے اطراف اپنی بہبود کا پہلو انھیں یاد ہوتا ہے جسے وہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ پرندوں اور دوسرے انسانوں کو مارنے کی مہم پر ہوں۔

ماں کی بلاشرکت محبت تشدد کے دائرے کو دوبارہ حرکت میں لے آئی ہے۔ جب کوئی اجنبی افق پر نمودار ہوتا ہے، یا کوئی محرومِ محبت، تو وہ ایسا مظلوم ہوتا ہے جس سے نفرت نظروں کے سامنے اس طرح اُگتی اور پھیلتی ہے جیسے جنگل کے وہ پودے جو نئے پودوں کو جنم دینے کے لئے بارش رکنے کا انتظار بھی نہیں کرتے۔ پھر وہ جسے اپنی ماں کی محبت اور دولت کی نعمت ملی ہے، اپنی رائفل اٹھاتا ہے اور حملہ کرنے چل دیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سب سے طاقتور ہے اور نہیں جانتا کہ وہ گولیاں اس کے ننگے سینے پر خونی الفاظ نقش کر دیں گی۔ ہلاکت خیزی میں، اس اجنبی کی طرح، وہ بھی غائب ہو جائے گا۔

ایک ناممکن تغیر کے لئے ہمیں کتنی دیر انتظار کرنا ہے؟ یہ خوف ہے، محبت نہیں، جو یہاں تمام اعمال کا محرک بن رہا ہے۔ سڑک پر کتا آپ کو آنکھوں میں دہشت لئے دیکھتا ہے۔ لڑنے والے کی ذہنیت ایک غار کے آدمی جیسی ہے اور اپنے حوصلے کے باوجود وہ نقاب چڑھا کر آگے بڑھتا ہے یا ریت کی بوریوں کے پیچھے گٹھڑی بنا گھنٹوں پڑا رہتا ہے۔ چھپ کر حملہ کرنے والے اور زر پرست تاجر جسے اس جنگ کی بدبو اپنی طرف کھینچتی ہے، سانپوں کی طرح اپنے شکار کے انتظار میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ اپنے جرائم کی اشتہا سے شرمندہ ہیں اور مکروہ انداز میں اپنی صلاحیت پر مغرور اور پھر اپنی رگوں کی تاریکی میں انھوں نے ایک قسم کی دہشت کو چھپا رکھا ہے جس نے ان سے قتل کروائے۔ الجیریا میں عربوں کے،

کانگو میں سیاہ فاموں کے اور بیروت میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے۔ اس ملک کے شہری خوف کے عادی ہیں۔ خوف، اپنی ماں کی محبت کا مستحق نہ ہونے کا بے انتہا خوف۔ اسکول یا کاروں کی دوڑ میں اوّل نہ آنے کا، اتنی بار جنسی عمل نہ کرنے کا جتنی بار دفتر میں دوسرے لوگ کرتے ہیں، اپنے ہمسائے جتنے پرندے نہ مارنے کا، کویتیوں سے کم امیر ہونے کا، شاہوں کے مقابلے میں تاریخ میں کم نمایاں ہونے کا، لاطینی امریکیوں جیسا اچھا رقص نہ کر سکنے کا، فلسطینی دہشت پسندوں کے مقابلے میں کم انتہا پسند اور کم تر "گردن مار" ہونے کا۔

مَیری روز انھیں خوف زدہ کرتی ہے۔ ان کے پاس دنیا کے تمام وسائل ہیں۔ اسے ایک لمحے میں کچل ڈالنے کے، اسے ہر طرح کی ذلت میں مبتلا کرنے کے، اسے ٹکڑوں میں کاٹ کے کسی تنگ گلی میں پھینک دینے کے اور اس کا نام اپنی فتح کے سرکاری اعلانات میں درج کرنے کے تمام اختیارات ہیں۔ لیکن ابتدا سے انھیں اس بات کا علم رہا ہے کہ وہ اس کا دل یا دماغ نہیں جیت پائیں گے۔ جتنا زیادہ وہ ان سے محبت کی بات کرتی ہے اتنے ہی وہ خوف زدہ ہوتے ہیں۔ منیر، ٹونی، فواد اور حتیٰ کہ بونا لیاس بھی جو کہ یتیم ہے، جس نے کبھی اپنی ماں کو نہیں جانا ہے، اپنے آپ کو ایک ایسی عورت کے سامنے پا کر جو اُن کے سامنے سر اٹھا سکتی ہے، خوفزدہ ہیں۔ ایک اونچی لہر کی طرح وہ ان کے تخیلات کی سرزمین سے ٹکراتی ہے۔ وہ ان کے اندر نفرتوں کے خلاف قدیم ترین دعائے مغفرت کی یادیں جگاتی ہے۔ ان کے نزدیک محبت ایک قسم کی آدمی خوری ہے۔ نسوانی علامات اپنے پنجوں سے انھیں پھاڑتی ہیں۔ سات ہزار سال سے دیوی آئسس بن باپ کے بچوں کو جنم دے رہی ہے۔ مصر میں جہاں سے یہ دیویاں گزرتی ہیں، کوئی زندہ نہیں بچتا۔ آئسس، بغداد میں اشتار اور مراکش میں انات! وہ صرف طاقت سے محبت کرتی تھیں۔ اپنے بھائی یا اپنے بیٹے سے۔ اور آپ توقع کرتے ہیں میری روز سے کہ وہ ان وحشت ناک عورتوں کے جلوس میں سر اوپر اٹھائے اور اس ملک کے مردوں کی آنکھوں میں کوئی وقار دریافت کرلے؟

وہ اس ''دوسرے شخص'' کے بارے میں سوچتی ہے جسے وہ ابھی چھوڑ کر آئی ہے اور جو ایک جان لیوا اندیشے میں مبتلا اس کے بچوں کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا ہو۔ وہ اس سے صابرہ کیمپ کی تنگ گلیوں میں اس دن ملی تھی جب وہ یو این ڈبلیو آر اے پہلی بار گئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لاپرواہ انداز میں کھیلتے ہوئے بچے، رسیوں پر پڑے رنگارنگ دھلے ہوئے رنگین دیواروں والے چھوٹے چھوٹے مکانات، بغیر سلاخوں اور بغیر شیشوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دواخانے سے واپس آ رہا تھا جہاں وہ اس دن ڈیوٹی پر متعین ڈاکٹر تھا۔ اس نے پہلے سخت لہجے میں بات کی، اس بات کا یقین کرنے کے لئے کہ وہ یہ نہ سوچے کہ وہ زیادہ آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ سمجھ گیا، مسکرایا اور اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔

ایک شام جب وہ حمرا کے کیفے میں لیموں کا جوس پی رہی تھی، وہ وہاں آیا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ وہ اس سے فلسطینیوں کے بارے میں اتنی محبت سے باتیں سن کر خوش تھا۔ ''ہمیں آپ جیسے اور لوگوں کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا: ''جو یہ جانتے ہیں کہ ہم بھیڑیے نہیں ہیں۔'' وہ ہنسی۔ اس نے اسے نہیں بتایا کہ اس نے تنظیم بنائی تھی جو ان کے نصب العین کے لئے کام کرتی تھی۔

ایک عافیت کا احساس کیفے پر چھایا ہوا تھا۔ باہر سینما ہالوں کی ایک قطار تھی۔ نوجوانوں کے گروہ، زیادہ تر دفتروں میں کام کرنے والے، سیلز گرلز، چھٹیوں پر آئے طلبا، مرد حجام اور قمیصیں بیچنے والے، ان کاروں کے ارد گرد جو وہاں گشت کر رہی تھیں، ٹیڑھے میڑھے چلتے ہوئے بار بار گزر رہے تھے۔ ہر ایک دھیمی رفتار سے چل رہا تھا کیونکہ کوئی نہیں چاہتا کہ وقت گزرے۔

اچانک اس نے ضرورت محسوس کی کہ اسے اپنی اس دن کی دریافت کے بارے میں بتائے۔ ایک ایسا خیال جیسا کہ اسے کافی عرصے سے نہیں سوجھا تھا۔ اپنے گھر سے کیفے تک

چلتے ہوئے جہاں وہ ہیرولا سینما کے باکس آفس کے کھلنے کا انتظار کر رہی تھی، ایک بڑا خیال اس کے دماغ پر چھا گیا تھا۔ ہر گزرتا ہوا شخص، اس نے کہا، ایک ذاتی دورانیۂ وقت سے بھرا ہوا ہے۔ ہر ایک وقت سے گزرتا ہے۔ پھر اگر ہر اس سیکنڈ کو جوان لوگوں میں سے ہر ایک گزارتا ہے، ہم میں سے ہر ایک گزارتا ہے، دنیا کے تمام لوگ گزارتے ہیں، اس لمحے جمع کیا جائے تو اس سے وقت کی تمام ابدیت بن جائے گی۔ اس نے خود کو بتایا کہ اس نے ایک نئی سمت دریافت کی ہے۔ ابھی لیموں کے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ وہ آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس نے اسے پوچھا تھا کہ وہ کسی چیز کے بارے میں پریشان تو نہیں۔ وہ ہنسی اور اسے بتانا شروع کر دیا کہ کس طرح وقت بھی خلا کی طرح غیر محدود اور پراسرار ہے۔ اس کے ہاتھ نہ دکھائی دینے والی لکیریں اور دائرے بناتے رہے۔ وہ تھوڑا سا چکرا گیا مگر محظوظ ہوتا رہا۔

وہ ایک ایسے آدمی سے باتیں کر کے جو اس کے چشمہ پہننے کی وجہ سے بے زار نہیں معلوم ہوتا تھا، خوش خوش گھر واپس گئی تھی۔ اس نے سوچا: وہ شاید اس سے زیادہ خوبصورت ہے جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھتی ہے۔

غسان کنعانی کے جنازے میں جو کار اسٹارٹ کرتے ہوئے، اپنے لئے لگائے گئے بم سے مارا گیا تھا، اس نے اسے دوبارہ دیکھا۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے دوسری عورتوں کے ساتھ تابوت کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ سکون کے ساتھ مجاہدین کے گروہ میں چل رہا تھا جن کی آنکھیں سرخ، ہونٹ تھکے ہوئے اور ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا وہ لوگ کتنے بدحال تھے اور ان کی نئی خانہ بدوشی کی نوعیت اس کی سمجھ میں آئی۔ اب وہ اپنے قبیلے اور اپنے ریوڑ سے سکون پانے والے خانہ بدوش نہیں تھے بلکہ ایک ایسی قوم تھے جس کا مستقل تعاقب کیا جا رہا ہو، گویا کسی آفاقی معاہدے کے تحت، جس میں اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے دشمن شامل ہوں، ان کے خودساختہ برادران بھی اور ان کے مخالفین بھی۔ جن کے پیروں

تلے ایک مربع گز بھی یقین اور تحفظ کا نہ ہو۔ انھیں مکمل دشمنی کی فضا میں ہی ایک قوم بننا ہے۔ وہ دھوکے سے آراستہ فضا میں سانس لیتے ہیں۔

میری روز اور نوجوان ڈاکٹر مقتول مجاہد شاعر کے جنازے میں اکٹھے رہے۔ اکٹھے وہ جلاوطنوں کے چھوٹے سے قبرستان کو چھوڑ کر، بے ترتیب ہجوم میں داخل ہوئے۔ چند قدم وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے رہے لیکن پھر جھینپ کر الگ ہو گئے۔ وہ اس کے پیچھے آیا اور بالآخر اس کے پاس پہنچ گیا اور جب گرم دوپہر ڈھل رہی تھی، وہ بغیر اک لفظ بولے دھمکیاں دیتے آسمان کے نیچے، گلیوں سے گزرتے ہوئے، اس زندگی سے بھرپور اور اداس ظریف کوارٹر کی سمت چلتے رہے جہاں وہ اپنے شوہر کو چھوڑنے کے بعد سے، اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ بچے موجود نہیں تھے۔ وہ چھٹی کا ایک ہفتہ اپنی پھوپھی کے پاس گزار رہے تھے۔ میری روز اکیلی تھی۔ وہ بھی اکیلا تھا۔ اس نے اسے اپنے بازوؤں میں لینے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ پوری رات کے دوران میں، اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا: ''تم میری بیوی ہو'' یا ''تم میرے بچوں کی ماں ہو۔'' اسے میری روز کو خوشی کے ساتھ اپنا بنانے کے لئے ڈنمارک کی سیر کے دوران میں دیکھی ہوئی عریانی سے بھرپور فلم کو اپنے ذہن میں چلانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ وہ سادگی کے ساتھ مکمل طور پر اس کے ساتھ ہونا چاہتا تھا اور میری روز اس کے ساتھ۔ اور جب اس نے میری روز سے کہا: ''میرا خیال ہے مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔'' تو اسے معلوم تھا کہ یہ سچ ہے اور اندھیرے میں اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔

اس کی گرفتاری کی خبر نے کیمپوں میں آبدوزی میزائل کا سا اثر کیا۔ ''خدا اُسے واپس لائے۔'' کچھ نے کہا، جبکہ دوسروں نے کہا: ''مقدس معصوم مریم! ہم تیرے لئے ایک سو شمعیں جلائیں گے اگر تو صرف اسے محفوظ اور صحیح سلامت واپس بھیج دے۔'' نوجوان ڈاکٹر جو مہینوں سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگا تھا جن میں سے کچھ صحت مند ہو رہے تھے اور کچھ

اذیت ہی میں تھے، جس نے کبھی بے ہوشی کی دوا کے بغیر، بجلی نہ ہونے کے باوجود اپنے اسسٹنٹ کی فلیش لائٹ میں آپریشن کئے تھے اور جس نے خود کو صحیح الدماغ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو رحم سے باز رہنے کی تربیت دی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بدقسمتی ایک طویل قیام کے لئے آگئی ہے۔ اس نے کئی گھنٹوں کے لئے کام بند کر دیا اور اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہا۔ اس نے آنسو بہانے کے لئے وقت نکالا۔ اس نے سب کچھ جو وہ جانتا تھا، مسترد کر دیا۔ وہ اپنا نام اور اپنی عمر بھول گیا۔ وہ اپنی اذیت کے احساس کے سوا عدم تک گھٹ گیا۔ وہ ان سب کی آنکھوں سے بچتا ہوا جو اسے جانتے تھے، گلی میں نکل آیا۔ انگشت بدنداں اناس کے درختوں کے تلے، کوڑے کے ڈھیروں میں گھومنے کے لئے جو اس کے مریضوں سے زیادہ بیمار تھے اور جن کے لئے اس نے عجیب قرب محسوس کیا۔ یہ لاغر درخت اتنی ہی مشکل سے زندہ تھے جتنی کہ فلسطینیوں کو تھی اور انھوں نے پہلے ہی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں، دوسری بمباریوں کو اور دوسرے غداروں کو دیکھ رکھا تھا۔ اس نے ان سے کہا: ''انھوں نے اسے پکڑ لیا ہے اور وہ اسے تکلیف پہنچائیں گے۔ وہ بے رحم ہیں۔'' ان درختوں کے گونگے پن میں فلسطینیوں کی ساری اذیت تھی۔ اس نے میری روز کی مدد نہ کر پانے کی مجبوری اور عجیب ذلت محسوس کی۔

وہ محاذ پر جنرل ہیڈ کوارٹر کی سمت جانے سے پہلے، چند منٹوں کے لئے زیرِ زمین پناہ گاہ میں واپس آیا جو ہسپتال کا کام دیتی تھی۔ مریض آرام کرنے کے لئے جنگ بندی سے فائدہ اٹھا رہے تھے، کم از کم وہ جو اَب بھی جنگ کے قابل تھے۔

دارالحکومت کے کئی مغربی علاقوں میں، فلسطینیوں کے حلیف حصوں میں، حتیٰ کہ خاندانوں میں جو کہ ان المیہ خبروں کے عادی تھے جو موسم کی رپورٹوں جیسی یکسانیت کے ساتھ دہرائی جاتی تھیں، ایک قسم کی موت کی سرسراہٹ پھیل گئی۔ حسیات نے جو کہ تکلیف کی روزانہ خوراک سے تقریباً مردہ ہو چکی تھیں، ایک بڑے صدمے کا تجربہ کیا۔ ٹیلیفون کالوں کی

تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ لوگ، پتھرائے ہوئے اور طیش کی حد کو پہنچے ہوئے، ایک دوسرے سے سوال کرنے باہر نکل گئے۔ ہر ایک جانتا تھا یہ جنگ کتنی خوفناک ہے مگر اس عورت کی گرفتاری جنگ کی ناانصافی کے خلاف بغاوت کے احساس کو، جو اب تک کہیں اندر چھپا ہوا تھا، روشنی میں لے آئی۔ متضاد افواہیں شہر میں گھومنے لگیں جہاں فطری طور پر زرخیز تخیلات مہینوں سے ضرورت سے زیادہ سرگرم تھے۔

جب لوگ اسے ہر جگہ تلاش کر رہے تھے اور اس کی گرفتاری کا بہت سی مشتبہ پارٹیوں نے انکار کر دیا تھا اور پھر اس کی تائید ہوگئی تھی۔ وہ اب تک انھیں وہاں اپنے سامنے بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ ابھی تک وہ اتنی پرسکون تھی کہ اس نے یہ سراغ پالیا کہ زیادہ جوشیلی زندگی جو سارا ملک گزار رہا تھا، ان تک آ پہنچی ہے، انھیں گھٹا رہی ہے اور انھیں مضمحل کر کے، ایک اکڑے ہوئے اور بظاہر بے جان لوتھڑے میں تبدیل کر رہی ہے۔ اس کا اپنا ذہن ایک کشتی کی طرح تھا جو دو دنیاؤں کے درمیان ڈول رہی تھی، باہر کی دنیا جس میں اس کے پیارے تھے، اس کے دوست اور اس کے جینے کا سامان جسے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ چار چہرے جو اب اس جگہ کے مالک تھے جہاں وہ مالک ہونے کی عادی تھی۔ وہ ایک مکمل درجے تک ان کی قیدی تھی کیونکہ ایک طویل عرصے سے اخلاقی اور عدالتی قانون التوا میں تھا اور عقل منہدم ہو چکی تھی۔

منیر اس کے لئے اب ایک مکمل اجنبی تھا۔ اسے لگا وہ اس دنیا کو جس سے منیر کا تعلق تھا، برسوں پہلے چھوڑ آئی تھی، اگر کبھی واقعی وہ اس کا حصہ تھی۔ وہ شاندار کپڑے پہنے تھا جبکہ اس کے ساتھی پارٹی یونیفارم پہنتے تھے۔ تشدد کا اس پر کوئی نشان نہیں تھا۔ قتل، اذیت دہی، وہ ان کا حصہ بننے سے بچنے میں کامیاب رہا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ ان کے لئے ذمہ داری محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ اب بھی بے عیب امیر بچہ تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے بارے میں فیصلہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوقات کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مکمل طور پر اپنی منطق میں مقفل

تھے، وہ ہر شے کے لئے غیر جاذب تھے۔اس نے ہلکی سی سمندری سفر کی متلی جیسی کیفیت میں، جو اس کی سوچوں کا حصہ بن گئی تھی، اپنی اور ان کی دنیاؤں کے درمیان فرق کے آثار کو دیکھا۔اس کا قصور اسے نوجوان سانولے پہروں، مستعد جسموں، روحانی اذیت سے ابھرتی ہوئی سرکشی اور فلسطینیوں کے بقا کی ضرورت تک لے گیا۔خانہ بدوشی نے ان کی آنکھوں میں سوال ڈال دیے جو اس لمحے جب انھوں نے خود کو قابلِ قبول محسوس کیا، روشن شرارے بن گئے۔اسے ان کی ضرورت تھی، اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

اس کے مقابل منیر خود مختار تھا۔وہ اس کے ساتھ دشمنی رکھتا تھا۔ان دو ماہ کے دوران ،، جب سے اس نے اپنے آپ کو اپنے فرقے کی جنگ میں غرق کر دیا تھا، وہ مستقل چڑ چڑا ہو رہا تھا۔ہر بات جو اس کے نئے کاموں سے تعلق نہیں رکھتی تھی، اسے غصہ دلاتی تھی۔ اپنے نقشوں اور ہندسوں کے سامنے، اس عمارت کی حفاظت کے منصوبوں یا پڑوس پر بمباری کے دوران میں، وہ ایک نرم لہجہ، ایک سکون اور ایک توازن محسوس کرتا تھا۔ان باتوں سے دور ایک بگڑے ہوئے بچے کی پرانی خامیاں سامنے آجاتی تھیں۔وہ لڑ رہا تھا۔بس یہی سب کچھ تھا۔کس لئے؟ محفوظ کرنے کے لئے۔کیا محفوظ کرنے کے لئے؟ اس کے گروہ کی طاقت۔وہ اس طاقت اور اس گروہ کا کیا کرے گا؟ ملک کی دوبارہ تعمیر۔کون سا ملک؟ یہاں ہر شے مبہم ہو جاتی تھی۔وہ اپنے قدموں تلے زمین کھو بیٹھتا تھا، کیونکہ اس ملک میں بہت زیادہ فرقے تھے، بہت زیادہ خیالات کے دھارے تھے، بہت زیادہ انفرادی معاملات تھے جو ایک نظریے میں سما نہیں سکتے تھے۔اس عورت کی موجودگی کی طرح جسے سڑک پر بلا سوچے سمجھے پکڑ لیا گیا، جس کو معمول کے مطابق اس کے قبیلے کا، اس جسم و خون کا حصہ ہونا چاہیے۔وہ ایک ایسا ملک تعمیر کرنا چاہتا تھا جہاں اس قسم کے مسائل کا وجود نہ ہو۔ لیکن مسئلہ اس خیالی ملک سے جو منیر بنانا چاہتا تھا، پہلے پیش آگیا۔اسے اصل عیسائیوں کو بچانے کے لئے ان غیر مقلد عیسائیوں سے لڑنا ہوگا۔اس کا سر گھوم گیا۔

لیکن کس طرح اس مصیبت کے مارے زمانوں میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ کس طرح ایک ایسے ملک میں جو لالچ سے شرابور ہے، انصاف زندہ رہ سکتا ہے؟ کس طرح کوئی پنجروں کے طوطوں میں تبدیل ہو جانے والے اور فرضی افسانوں سے بھرے دماغوں میں دھکم پیل کرتے خیالات کی تہوں کے پار صاف صاف دیکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟

وہ ہَوا جس میں عرب دنیا کا رخ متعین کرنے والے لوگ سانس لیتے ہیں، خاص طور پر شر آلود ہے۔ (یہ ایک بلی کو بلی کہنے اور مکاری کو حماقت اور حسد کا ملغوبہ کہنے کا وقت ہے۔) کسی شخص کو اپنی تقدیر کے علاوہ کسی شے سے دلچسپی نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ دوسروں کی تقدیر ہوتی ہے جسے فتح کرنا اور تباہ کرنا ہوتا ہے، ایک سچا سیاسی معرکہ، استحصال کی ضد، یہاں وجود نہیں رکھتا اور استحصال، اوہ خدا! کس طرح وہ جانتے ہیں اسے کیسے کرنا چاہیے۔ اگر انسانی ریڑھ کی ہڈی اس کی عادی ہو سکے، وہ لوگوں کو چار ہاتھ پیروں پر چلنے پر مجبور کریں۔ سیاسی معرکہ وہ نہیں جانتے شاعرانہ معرکے جیسا ہی ہے۔ چی گویرا اور بدر شاکر الصایاب میں یہ بات مشترک ہے کہ ان دونوں کی نقل نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہمیشہ اگلا دور، اگلی نظم یا جنگل میں اگلا مارچ ہوتا ہے جو ان کی تشکیل کرتا ہے۔ ہمارے رہنما بیٹھے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ جب وہ اقتدار میں آتے ہیں تو اپنی کرسیوں پر پھولتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا جسم اور کرسی ناقابلِ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس معاشرے میں جہاں آزادیِ انتخاب اگر کوئی ہے تو صرف کاروں کی مختلف قسموں میں ہے، کیا انصاف کا کوئی تصور وجود رکھ سکتا ہے اور کیا نسل کشی ایک ناقابلِ مفر انجام نہیں بن جاتی؟

چنانچہ جب ناممکن تغیر پیش آ جاتا ہے، جب مثال کے طور پر میری روز کی طرح کوئی شخص چیزوں کی عام ترتیب بدل دیتا ہے تو سیاست کا جسم اپنے مدافعتی جراثیم کو ایک اندھے خودکار عمل کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔ وہ جرثومہ جو آزادی کی خواہش رکھتا ہے، مار دیا جاتا ہے، ہضم کیا جاتا ہے اور دوبارہ جذب کر لیا جاتا ہے۔

تین

ا

ہم باہر کا نظارہ کرنے کھڑکی پر جا رہے ہیں۔ اس میں ہمیشہ زیادہ لطف آتا ہے.
ہونٹوں پر وہ باتیں پڑھنا سیکھنے کے مقابلے میں جنھیں بیشتر اوقات ہم نہیں جانیں گے اور
جن کے بارے میں ہمارے پاس کہنے کے لئے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن ہمارے پاس یقیناً
کہنے کے لئے باتیں ہیں، بہت سی باتیں، مگر کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔

آج دوسرا دن ہے۔ وہ کل رات کہاں سوئے؟ ہم اپنے رہائشی کمروں میں چلے گئے
تھے اور آج صبح انھوں نے ہمیں جگایا، ہماری قطاریں بنوائیں اور حسبِ معمول ہمیں کلاس
روم میں آنے پر مجبور کرلیا۔

اگرچہ اس سال اسکول ایسا نہیں رہا جیسا کہ یہ ہُوا کرتا تھا۔ بار بار بند ہوتا ہے۔ لمبی
چھٹیاں ہو جاتی ہیں۔ ہمارے بہت سے ہم جماعت دُور دراز فرانس اور انگلینڈ چلے گئے،
جبکہ ہم جنگ کے خاتمے کا انتظار کرتے ہوئے یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس جنگ نے ہر
شے کا جو ہم دیکھتے ہیں، رنگ بدل دیا ہے۔ مرد نیلا رنگ کم سے کم پہنتے ہیں۔ وہ سرمئی رنگ
اب زیادہ پہنتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ فوجی یونیفارم پہنتے ہیں۔ کاریں بھی بدل گئی ہیں۔ بہت سی
تیز گاڑیاں اور جیپیں ہیں جو بہت تیز چلتی ہیں۔ کسی کو ان کے ٹوٹنے کا خوف نہیں ہوتا۔

بلیاں بھی پہلے سے زیادہ آزاد ہیں۔ کوئی انہیں مارتا نہیں یا پیچھا کر کے نہیں بھگاتا۔ وہ بالکونیوں، چھتوں، دیواروں، گلیوں، کوڑے کے ڈبوں، تباہ شدہ عمارتوں میں ہر جگہ ہیں۔ ہر جگہ بہت سے چوہے بھی ہیں اور بلیاں اب انھیں نہیں کھاتیں۔

وہ ابھی تک ہمارے سامنے بیٹھے ہیں۔ یہ فلموں کے سین کی طرح ہے۔ وہ بہت ڈراؤنے ہیں۔ آج ہمارے لئے کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔ اگر آج کا دن بھی کل کی طرح ہے تو کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔ لیکن وہ انھیں چلے جانے کے لئے کیوں نہیں کہتیں؟ یہ سچ ہے کہ بہت عرصے سے پولیس کے لوگ نظر نہیں آئے۔ کیا وہ ان سے خوفزدہ ہیں، وہ جو کبھی نہیں ڈرتیں؟ ہم انھیں بار بار دیکھتے ہیں مگر ان کی آنکھیں ہم سے نہیں ملتیں۔ ان کی آنکھیں کچھ نہیں کہتیں۔ وہ آسمان کی طرح نیلی ہیں۔ آسمان، ہمارا باپ آسمان۔

صرف اگر ہم بالکل اچانک ہی بڑے ہو جائیں تو ہم ان کی حفاظت کریں گے۔ ہم ان لوگوں کو پیٹیں گے، محمد علی چیمپیئن کی طرح۔ ہم ان کے سر توڑ دیں گے اور ان کی گردنیں مروڑ کر رکھ دیں گے۔ لیکن ابھی ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں؟

کچھ عرصے سے جنازے بہت نکل رہے ہیں۔ جنازوں میں اداسی ہوتی ہے مگر یہ سکول جانے سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیشہ بہت سے پھول ہوتے ہیں اور اچھی خوشبو وتی ہے۔ اس سال جنازے زیادہ اور پھول کم ہیں۔ ایسے لوگ بھی نظر آئے ہیں جنھیں دفن نہیں کیا گیا۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں گئے۔ شادیاں اور پارٹیاں معمول سے کم رہی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کہ ایک مختلف قسم کی پارٹی ہو رہی ہو۔ وہ لوگ جو باتیں کر سکتے ہیں اور سن سکتے ہیں، جنگ میں خوب مزہ لیتے ہوں گے۔ وہ خوب خوش نظر آتے ہیں۔ ہم اپنے اندر بند ہیں۔

ہم نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ کوئی بہت خراب بات پیش آنے والی ہے۔ ہم انتظار سے تھک چکے ہیں۔ کوئی واقعی خراب بات ہونے والی ہے۔ وہ آدمی زیادہ سے زیادہ

خونخوار بنتے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں خونی ہو رہی ہیں۔ وہ مس میری روز کو ایسی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جیسی اندھیرے میں بلیوں کی ہوتی ہیں۔ وہ آنکھیں صرف چمکنے سے زیادہ کچھ کرتی ہیں۔ ہر شے چمکتی ہے۔ جب وہ گلی میں پھر رہے تھے، انھوں نے اپنی ماؤں کے موزوں سے کاٹ کر بنائے ہوئے نقاب پہنے ہوئے تھے جن سے وہ سوروں یا بیلوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ انھوں نے کیا اتنا ہی خراب کام کیا تھا کہ انھیں اپنے آپ کو چھپانا پڑا؟ لیکن اب یہ زیادہ بدتر ہے۔ وہ زیادہ ڈراؤنے بھی ہو گئے ہیں۔ وہ کپکپاتے ہیں۔ وہ ایک طوفانی آسمان کی طرح نظر آتے ہیں اور ہم بیک وقت گرمی اور سردی محسوس کرتے ہیں۔

مس میری روز کانپتی ہیں مگر وہ ہمیشہ مختلف سی نظر آتی ہیں۔ ہم ان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اپنے والدین سے زیادہ، کیک سے زیادہ، چھٹیوں سے زیادہ، سمندر سے زیادہ۔ اگر وہ چلی گئیں تو ہم بھی چلے جائیں گے۔ کہاں؟ ہم نہیں جانتے؟ لیکن ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔

لیکن وہ کہیں نہیں جا رہی ہیں۔ وہ کہاں جا سکتی ہیں؟ جنگ ہو رہی ہے اور کشتیاں نہیں چل رہیں۔ انھوں نے ہوائی اڈے پر بم گرائے ہیں اور ہوائی جہاز بھی نہیں چل رہے ہیں۔

وہ کبھی کوئی برائی نہیں کرتیں۔ مس میری روز، وہ اچھی ہیں۔ وہ ہمیشہ بتاتی ہیں کہ کتوں کی دُم نہ کھینچیں، نہ صحن میں لڑائی کریں اور جب زیادہ پسینہ آرہا ہو تو زکام سے بچیں۔

یہ لوگ باتیں کیے جا رہے ہیں۔ یہ انھیں تھکا رہے ہیں۔ یہ انھیں آہستہ آہستہ بے کار کر رہے ہیں۔ یہ انھیں تکلیف میں مبتلا کر رہے ہیں، اور پھر بھی، بس انہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ ان لوگوں کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیں۔ لیکن وہ کس کو مدد کے لئے بلا سکتی ہیں؟ اور کیسے؟ پاس پڑوس میں مزید کوئی لوگ نہیں رہ گئے ہیں۔

وہ ہمیں بالکل بھول گئے ہیں لیکن ہم ہر بات دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک چلا

گیا ہے اور دوسرے سب ان پر مسلط ہیں۔ شیطان زمین کے نیچے سے نکل آئے ہیں اور ان پر آن پڑے ہیں۔ ہوا میں ایک دھما کا ہوا ہے اور اس کمرے میں درخت گر رہے ہیں۔ ہر چیز گھوم رہی ہے۔ کوئی انسان ایسا نہیں کرے گا جو وہ کرر ہے ہیں۔ وہ کہاں سے آئے؟ وہ اتنے وحشی کیسے ہو گئے؟ وہ ڈوب گئی ہیں! وہ ڈوب گئی ہیں! خون میں شاید۔ ایک دن ہمیں گفتار اور آواز واپس مل جائے گی۔ ہم سننے اور بولنے کے قابل ہوں گے اور کہہ سکیں گے کہ کیا ہوا۔ لیکن یہ یقینی نہیں ہے۔ کچھ بیماریاں ناقابلِ علاج ہیں۔

۲

آج صبح روشنی اتنی سفید کیوں ہے؟ اک خراش کا سا درد میرے گلے کو کھرچ رہا ہے۔
تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شہر نے خود کو مار لیا تاکہ موت کی لامحدودیت میں داخل ہونے سے پہلے، میں زندگی کی لامحدودیت میں غوطہ لگا سکوں۔ آسمان کی یہ سازش اب میرا واحد راستہ ہے۔ دیواریں سب سے زیادہ تنگ تاریکی میں ہو جاتی ہیں۔
اس تمام رات کے دوران میں اپنے ٹخنوں، گھٹنوں، اپنے معدے اور اپنی گردن کا راستہ گم کرتی رہی۔ میں نے اپنے ذہن میں ہندسوں کی لکیر بنائی اور انھیں گنتی رہی۔ میں نے خوف کا تعاقب کر کے، اپنے ذہن سے نکالا مگر وہ ہر شے میں کوٹ کوٹ کر بھر گیا۔ ہوا بوجھل ہو گئی اور میں نے اسے ایک گیند کی طرح نگلا۔

میں نے دعاؤں کو اپنی نجات کے لئے بلایا مگر وہ نہیں آئیں۔ نفرت نے مجھے اپنے شر میں جکڑ لیا۔ میرے سینے کے پٹھے سکڑ گئے اور یہ سختی سیدھی ایک فولادی ہاتھ کی طرح میری گردن کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ کئی بار، اس رات کے دوران میں جو کبھی ختم ہوتی معلوم نہیں ہوتی تھی، میری سانس گھٹ گئی۔ میں ایک سرد پسینے میں اینٹھ رہی تھی اور چیخنے سے خوف زدہ

تھی اور اپنے خانوں میں میری آنکھیں دکھ رہی تھیں جیسے کہ وہ مجھے چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ رات کی ضخامت کو ایک چاقو سے کاٹا جاسکتا تھا۔ میرے تھوک نے نگلے جانے سے انکار کر دیا اور میں تھکن سے چور تھی۔

تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ مجھ سے وقت کی پیمائش کروانا جیسا کہ دوسرے لوگ دریاؤں کی پیمائش کرتے ہیں؟ مجھے اس زندہ درخت سے، جس میں وہ سب کچھ ہے جو مجھے عزیز ہے، جدا کرنا؟ میں نے چھوٹے چھوٹے سرخ ستارے دیکھے جو بہرا کر دینے والی آواز کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ میں نے انھیں خاموش کیا۔ وہ بستر کے گرد چیخنے کے لئے لوٹ آئے جس پر کہ میں یقینی طور پر آخری بار لیٹی تھی۔ اس پاتال کو عبور کرنا جو نیند اور موت کی متوازی سطحوں کے درمیان ہے، سب سے مشکل ہے۔ میں نے اس فاصلے کو دہرایا جیسا کہ بچہ اپنا ہوم ورک دہراتا ہے۔ میں نے اس سبق کو زبانی یاد کیا جو کبھی پڑھایا نہیں گیا۔

یہاں میں اک میدانِ جنگ میں ہوں۔ یہ اک چاروں طرف سے بند خطۂ زمین ہے جہاں یہ قطعی لازم ہے کہ کوئی مرے گا۔ موت ہمیشہ اک جنگ کی موجودگی کا تعین کرتی ہے۔

تمام سرزمینوں کی اک مخصوص ہیئت ہوتی ہے۔ یہ جس پر میں ہوں، چپٹی ہے جس پر کوئی گھاس نہیں۔ صرف کرسیاں ہیں، کوئی درخت نہیں۔ صرف تختہ سیاہ ہے، کوئی گھوڑے نہیں۔ صرف ملیشیا کے جوان ہیں، کوئی کسان گواہ نہیں۔ صرف معذور بچے ہیں کوئی پاؤڈر نہیں نہ کوئی بم۔ صرف اذیت دہی کے آلات ہیں۔

موت کبھی صیغۂ جمع میں نہیں ہوتی۔ ہمیں اس کی فتح میں مبالغہ نہیں کرنا چاہے۔ یہ کافی قطعیت رکھتی ہے۔ ہمیں اس فتح کے بارے میں گیت نہیں گانا چاہیے۔ لاکھوں اموات نہیں ہوتیں۔ ایک ہی فرد لاکھوں مرتبہ مرتا ہے۔

وہ شہر کے دوسری طرف ہے۔ وہ جو میرا انتظار کر رہا ہے۔ وحشت اسے اپنے دانتوں تلے چھپا رہی ہے اور وہ روتا ہے۔ وحشت ہمارے ساتھیوں کو بھی چبا رہی ہے۔ ہم سب

کے ساتھ یہی ہوتا ہے جب ہم میں سے کسی کو دیر ہو جاتی ہے یا وہ کچھ زیادہ دیر کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ کبھی واپس نہیں لوٹے۔ کچھ لوگ ٹکڑوں میں کٹے ہوئے، پلاسٹک کے تھیلوں میں اپنی ماؤں کے دروازوں پر رکھے ہوئے واپس آتے ہیں۔

بیروت ایک بندرگاہ ہے۔ کبھی کسی بندرگاہ کا ایسا محاصرہ نہیں ہوا۔ کبھی کوئی شہر اتنے سفاک آسمان کے نیچے نہیں آیا۔

میری محبت نے مجھ سے ایک سیبوں کے باغ کا وعدہ کیا۔ آج یہ موت ہے۔ جس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ اس لمحے میں اس شخص سے ہمیشہ سے زیادہ قریب محسوس کرتی ہوں۔ تمام رات میں نے امی سے باتیں کیں، اسے بتایا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے اپنی موت پر تشفی دی۔ کیا اس نے مجھے سنا؟ اس کی جنگ جاری رہنا چاہیے۔ میں جانتی ہوں یہ چلے گی۔ میرے لئے راستہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

میں تھکی ہوئی ہوں۔ میری موت بہر حال ان کے لئے بہت کم محرومی کا باعث ہوگی۔ شہر کے دوسرے حصے میں، یہ ایک خوبصورت دن ہوگا اور سڑکیں، اس کے باوجود کہ وہاں گولیاں چل رہی ہوں گی، زندگی سے بھرپور ہوں گی۔ کتنے معصوم اور بہادر ہیں یہ لوگ جن کی قوتِ حیات موت کے مقابل ہوتی ہے۔ کیا ان کی آنکھوں میں چمکتی روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ جائیں گی؟ کیا ضرور ایک منحوس طلوعِ آفتاب کو اک کفن کی طرح ان کے پیارے جسموں پر پھیل جانا ہے؟ کیا ضرور ہمارے نوجوان لوگوں کی قوت کو ٹینکوں کے نیچے کچلا جانا ہے؟ کیا ضرور انھیں اپنے دیار کے بغیر زندہ رہنا اور مر جانا ہے جبکہ یہ حق ایک بھیڑیے کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ کیا ضرور اس خوف، نفرت اور حسد کے مرکب سے ان کے ولولے کو شکست کھانا ہے؟ کاش کہ صرف یہ یقین ہو کہ وہ میری موت کے بعد کافی عرصے تک زندہ رہیں گے۔

وہ سب پھٹکاریں کہاں ہیں جن کے لئے ہماری نسل مشہور ہے؟ میرے اندر

بد عاؤں کی طاقت نہیں۔ نہ ہی نئی بد نصیبیوں کا تصور کرنے کی خواہش ہے۔اے خدا تو جو کوئی بھی ہے، آنے والی نسلوں کو اس نسل کشی سے محفوظ رکھ جوان کی منتظر ہے۔ میں ہر ایک کے ساتھ پر امن تعلق چاہتی ہوں۔ اپنے پکڑنے والوں کے ساتھ بھی میں امن چاہتی ہوں۔ میں اس نفرت کو مزید قائم نہیں رکھ سکتی۔ یہی ہے جو اس قیامت تک لائی ہے۔

ان مکھیوں کو بھگا دو جو میرے سر کے گرد بھنبھنا رہی ہیں۔ ان بوجھوں کو اٹھا دو۔ میں سونا نہیں چاہتی۔ ان آخری چند گھنٹوں کو جو باقی رہ گئے ہیں کھو دینا، یہ آخری چند منٹ جبکہ میرے پیاروں کے چہرے اب تک میری یادداشت میں جانے پہچانے ہیں۔ میں اس بدحال صبح کا انتظار نہیں کرنا چاہتی، گرمی سے گزر کر، سردی تک جانے کا ادراک، کپکپاہٹ کا جو مجھ پر طاری ہو جائے گی، میں کسی اور کو اس کی بددعا نہیں دوں گی۔ میں اپنے جلادوں کی مرضی سے دیواروں میں بند ہوں۔ کھڑکی کے شیشے اور انگلی کے درمیان پھنسی ہوئی اک مکھی کی طرح۔ میں مزید اس حقیقت کو جاننا کہ میں مرنے والی ہوں، برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ بالکل نہیں کر سکتی۔ میں ابھی سے روشنی کی بہ نسبت اندھیرے سے زیادہ قریب آ گئی ہوں۔

۳

''ہمیں جلد کام کرنا ہے۔ جنگ بندی کی آج خلاف ورزی ہوئی ہے اور ہمیں تیزی سے کام کرنا ہے۔ میں نے تمھیں بچانے کے لئے سب کچھ کیا ہے مگر تمھیں مدد کرنا ہوگی۔''

''مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا ہے۔''

''دشمن کیمپ نے ہم سے رابطہ قائم کیا ہے۔ کچھ قیدیوں سے، میرا مطلب ہے یرغمالیوں سے جنھیں انھوں نے گرفتار کر رکھا ہے، تمھارا تبادلہ کرنے کے لئے۔ وہ یہاں تک بڑھے کہ صرف تمھارے بدلے انھوں نے گیارہ یرغمالیوں کو دینے کی تجویز پیش کی۔ تمھارے سربراہوں میں سے ایک نے پارٹی کے دفتر فون کیا۔''

''......''

''تمھیں کچھ نہیں کہنا ہے؟ تمھارے ساتھ میرے صبر کا دامن زیادہ سے زیادہ چھوٹتا جا رہا ہے اور پھر بھی میں تمھاری زندگی بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''تم میرا تبادلہ نہیں کر سکتے۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ تم نے یہ کیسے سمجھا کہ تمھاری سودے بازی میں ایک حقیر شے کا کام انجام دینے کے بجائے میں مرنے کو ترجیح نہیں دوں

گی؟ جنگ میں بھی تم سوائے قالینوں کے تاجروں کے کچھ نہیں۔''

''ہماری ہتک کر کے، تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمھارے اپنے بچے ہیں۔ کم از کم تم ان کے بارے میں سوچ سکتی ہو۔''

''میں اپنے بچوں کو کیسے بتا سکتی ہوں کہ میری زندگی ایک ایسے سودے کی بھیک ہے؟''

''تو تم اپنی ناک اونچی رکھنے کو ترجیح دو گی؟''

''تم نے اس سارے قصے میں کچھ نہیں سمجھا۔ تم اندھوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ تم معصوم لوگوں کے گلے کاٹ رہے ہو۔''

''وہ ہمیشہ سے غیر ملکی تھے اور آج بھی غیر ملکی ہیں۔ وہ یہاں اتنے ہی بے وطن ہیں جتنا بھیڑیے کی کھوہ میں لومڑی۔''

''اور تم چاہتے ہو کہ میں خود کو تمھارے کمینے سودوں کا حصہ بنا لوں؟''

''یہ کسی نے نہیں کہا کہ اس تبادلے کی شرائط منظور کر لی گئیں۔ پارٹی کے مرکزی دفتر نے پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسری پیش کش جو وہ کر رہے ہیں، قبول کرے گا۔ تمھارے فلسطینی ''دوست'' نے تمھاری جگہ خود کو قیدی بنانے کی پیش کش کی ہے۔ وہ تمھارے نصب العین کے لئے ایک حقیقی جنونی ہوگا۔ تم سات سال اکٹھے رہے ہو۔ یہ ایک لمبا عرصہ ہے۔ وہ تمھاری درجہ بندی کے حساب سے ایک اہم شخصیت ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک اچھی گرفتاری ہوگی۔ میں نے پارٹی کے سربراہوں کو یہ پیشکش منظور کر لینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس سے سارے حسابات بے باق ہو جائیں گے اور تم آزاد ہو جاؤ گی۔''

''تم اس آدمی کو چھونے کی جرأت کرو گے؟ تم قاتلو! تم اس پر لکڑ بگھے کے جتھے کی طرح ٹوٹ پڑو گے۔ قاتلو! اک سال سے تم لاشوں کے ڈھیر لگا رہے ہو اور اب تم اس آدمی کے جسم کا اضافہ کرنا چاہتے ہو جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ ایک سال سے تم فلسطینی لوگوں

کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم بھاڑے کے ٹٹوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے جسم تمھاری مٹی کا حصہ بن گئے ہیں۔ تم ہر سانس کے ساتھ انھیں اپنے اندر لے جاؤ گے۔ تم انھیں اپنے پھلوں کے ساتھ کھاؤ گے۔ اپنے دریاؤں سے پیو گے۔ تم انھیں اپنے بستروں میں موجود پاؤ گے اور اپنے بچوں کے نقوش میں پہچان لو گے۔ قاتلو! میں تمھاری آنکھیں نکال لوں گی۔ اے خدا! یہ سب کتنا تکلیف دہ ہے!''

۴

منیر اور میرے درمیان خون کا رشتہ ہے۔ عام طور پر میں ہمیشہ اس کی بات سنتا ہوں اور اس کے پیچھے چلتا ہوں۔ وہ جو Skiing کا چیمپئن ہے اور بہترین شکاری ہے جب کہ میں ہمیشہ دوسرے نمبر پر ہوتا ہوں۔ اب وہ سالاری کر رہا ہے۔ وہ ہم سب سے زیادہ ہوشیار ہے مگر مجھے اپنی بہادری پر فخر ہے۔ وہ ہچکچاتا ہے۔ جب تک لڑائی ختم نہیں ہو جاتی وہ دفتروں کے اندر ہی رہتا ہے اور پھر وہ دونوں اطراف کے مردوں کا شمار کرنے باہر نکلتا ہے۔ اس نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھوں سے نہیں مارا۔ میں، میں ایک شیر سے زیادہ بہادر ہوں۔ میں اپنے انداز میں، لوگوں کا رہنما ہوں جیسے کہ وہ ہے۔ میں ایک چلتا پھرتا ہدف ہوں۔ دوسرے میری جانبازی کو مثال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور وہ پسندیدگی جو مجھے ان کی آنکھوں میں نظر آتی ہے، میرا واحد انعام ہے۔ جنگ نے سب کو بالآخر ایک درجے پر لا کر، ہمارے سماجی تفاوت کو ہموار کر دیا ہے۔ میری روز اس داستان کے لئے جس کو بنانے کے عمل میں ہم مصروف ہیں، ناگزیر نہیں ہے۔ وہ صرف اس تالاب میں پانی کا ایک قطرہ ہے۔ میں اپنی فتح کے درخت پر اس کا سر لٹکا سکتا تھا، اگر چہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ منیرا سے

قبول نہیں کرے گا اور میرے لئے اس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ یہ پہاڑی ناقابلِ فتح رہی ہے۔ بے شک یہ کوئی سلطنت نہیں بلکہ جنگلی جانوروں کا مسکن ہے۔ ہمیں مکمل آزادی ہے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ ایک پرندہ بھی نہیں۔ ایک مکھی بھی نہیں۔ ان چوٹیوں پر بالکل تنہائی ہے۔ منیر انسانی خون پر نظر پڑتے ہی کانپنے لگتا ہے۔ جانوروں کا خون اسے پریشان نہیں کرتا۔ وہ اس کا عادی ہو جائے گا کیونکہ یہ جنگ ایک لمبے عرصے تک چلنے والی ہے۔ جب تک ہماری زمین پر ایک فلسطینی بھی رہ رہا ہے، ہم لڑائی جاری رکھیں گے۔ جب تک میں زندہ ہوں، وہ مرتے رہیں گے۔ میں اس کے لئے اس صلیب کی جو میں نے پہنی ہوئی ہے، قسم کھاتا ہوں۔

انسان فطرت کے راستے میں حائل صرف ایک لال بیگ ہے۔ یہ نسوانی عفریت جو ہمارے رحم و کرم پر ہے، ہمارے سامنے سر اٹھانے کی جرأت کرتی ہے۔ کیا احمق ہے! مجھے اسے ایک کھٹمل کی طرح اسی لمحے مسل دینا چاہیے تھا جب ہم نے اسے پکڑا تھا۔ وہ اس سے باتیں کیے جا رہے ہیں، سوال کیے جا رہے ہیں، اور کس لئے؟ منیر خود کو ٹھنڈا رکھنا چاہتا ہے۔ وہ پاگل ہے۔ ہزاروں اموات کو اس جھوٹی شائستگی کے تصنع کو مٹا دینا چاہیے تھا۔ میں، میں جانتا ہوں کہ طاقت درست و نادرست کا فیصلہ کرتی ہے۔ بھیڑیا بھیڑ کو کھانے سے پہلے اس سے اجازت نہیں مانگتا۔ یہ بھیڑیے کی حیثیت سے اس کا حق ہے۔

وہ ایک کتے کی طرح غرائی، اس نے میرا چہرہ نوچا، اس نے میری پتلون پر قے کر دی۔ لیکن میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی جان بخشی۔ اور یہ ہمیں گھورتے ہوئے بے وقوف بچے۔ یہ کبھی نہیں بھولیں گے کہ غدار ہونے کی قیمت کیا ہے۔ جنگ دوبارہ جاری ہو گئی ہے۔ توپ کی گرج کی آواز ہے!

٦

میری بیٹی، تمھارا وقت نزدیک آرہا ہے۔ شیطان منتظر ہے۔ تمھارے سر کے اوپر صلیبی مجسمہ اذیت میں ہے۔ یہ کوئی عام حالات نہیں ہیں۔ عیسائیت خطرے میں ہے۔ یہ ضد کرنے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ خدا نے اعتراضات کا موقع فراہم کیا ہے تا کہ تم اپنی سلیٹ صاف کر سکو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تمھیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اس مدد پر جو تم نے ہمارے دشمنوں کو دی، خلوص کے ساتھ پچھتاوا کرو، تمھارے اعمال کا محرک تمھارا سچا دل تھا، مجھے یقین ہے، مگر ناواقف دماغ بھی۔ مجھے یقین ہے تمھیں معلوم نہیں تھا وہ ہمارے ساتھ کتنی برائی کرنا چاہتے ہیں۔

''میں نے خود مذہبی مجلسوں میں، اتوار کے خطبات میں، پہاڑ پر واقع بہت سے چھوٹے گرجوں میں، ان کے نصب العین کی طرفداری کی ہے۔ میں کہتا تھا کہ ہمارے خدا کی سرزمین پر دوسروں کا قبضہ ہے اور اس کے باشندے کیمپوں میں، مصائب میں گھرے، زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم فیاض تھے۔ ہم نے انھیں جگہ دی اور پھر وہ ان بین الاقوامی بدمعاشوں کے پاس چلے گئے اور اپنے کیمپوں کو چوروں کے اڈوں میں بدل ڈالا۔ وہ سرخ

جاپانیوں اور پاکستانی قاتلوں کو لے کر آئے۔ وہ خدا کے نام کے خلاف کفر بکتے ہیں اور یہاں تک سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ وجود نہیں رکھتا۔''

''میں تھک گئی ہوں بونالیاس! تمھارے الفاظ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ تم میکانکی انداز میں بغیر جانے کہ تم کیا کہہ رہے ہو، بات کرتے ہو۔ اس ملک کی چیزوں میں کوئی باریک فرق، کوئی سایہ نہیں ہے۔ آسمان نیلا ہے۔ تمھاری آنکھیں سفید ہیں اور تمھارے دل کالے۔ یہ ایسا ہی ہے۔ میں کیسے تمھیں واپس بلا سکتی ہوں۔ کیسے میں سمجھا سکتی ہوں کہ وہ تمھارے دشمن نہیں بلکہ ہمارے بھائی ہیں، خون اور تاریخ دونوں کے اعتبار سے۔''

''میری بیٹی! اشتاب تمھیں تکلیف پہنچانے والے ہیں اور میں تمھیں ان کی اذیتوں سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''تم میری تکلیف کی فکر کرتے ہو؟ اس تکلیف کے بارے میں کیا کہو گے جو تم نے صدیوں سے لوگوں پر مسلط کی ہوئی ہے؟ وہ تکلیف جسے تم نے تسلیم کیا کہ لوگوں کو برداشت کرنی چاہیے؟ وہ نسل در نسل ذلتیں اور سب کچھ کس کے نام پر؟ کس ہستی کے؟''

''تم یہ تو نہیں چاہتیں کہ میں کوشش کر کے مشیتِ ایزدی کی تم سے وضاحت کروں؟''

''انھوں نے تم سے کہا کہ اپنے ہمسائے سے محبت کرو اور تم ایک دوسرے کو کھاتے ہو۔ تم ریڈ کراس کی ایمبولینسوں کے نیچے بم لگاتے ہو کیونکہ وہ ان کے زخمیوں کا بھی علاج کرتے ہیں۔ بھیڑیے، کیڑے مکوڑے اور سوّر اپنی نسل کو اس طرح نقصان نہیں پہنچاتے جیسا کہ تم پہنچانا جانتے ہو، اور یہ سب قبیلے کی محبت کے نام پر۔ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ تم اس گروہ کے ساتھ جس سے تمھارا تعلق ہے، بت پرستی میں مصروف ہو۔''

''تم اس عظمت کو جس نے ہمیں ایک بندھن میں باندھا ہوا ہے، اس عقیدت کو جو ہمارے نوجوان پارٹی کے لئے مرتے ہوئے دکھاتے ہیں اور ان کی اپنے ساتھیوں کی محبت

کے لئے عظیم ترین قربانی کو رد کرتی ہو؟''

''کون سی محبت؟ دس کروڑ سے زیادہ عرب اور ایک بھی نہیں جانتا محبت کیسے کرتے ہیں! تم صرف اپنے آپ سے محبت میں گرفتار ہو۔ تم اپنے ہر لگاؤ میں اپنی ہی شبیہ کو ڈھونڈتے ہو۔ تمھارے جذبے کا رخ ہمیشہ اپنی ہی سمت ہوتا ہے۔ نہیں بونا لیاس، مذہبی منصب داروں نے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے دلوں کو صحراؤں میں تبدیل کر دیا ہے جو اِن صحراؤں سے جنھیں ہم ہر موسم میں پیدل پار کر لیتے ہیں، غیر محدود حد تک زیادہ بے برگ و گیاہ ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ واحد سچی محبت اجنبی سے محبت ہے۔ جب تم اپنی پیدائشی نال کاٹ دو گے جس نے تمھیں ایک ساتھ جکڑا ہوا ہے، تو آخر کار تم حقیقی انسان بن جاؤ گے اور زندگی تمھارے لئے اک معنویت رکھے گی۔''

''خدا تمھیں معاف کرے، میری بیٹی! تمھیں اس ملک کے حسن کا، ان دنوں کا جو اب تک تمھارے آگے ہیں اور اپنی جوانی کا کوئی احساس نہیں۔''

''یہ ملک خون سے داغدار ہو رہا ہے۔ دیواریں خون سے لت پت ہیں اور کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جس نے اپنی آنکھوں سے ایک لاش یا ایک پھانسی نہ دیکھی ہو۔ یہ ایک بیمار دنیا ہے، جس کے حوضوں میں تیل اور خانقاہوں کے بالا خانوں پر توپیں ہیں...... ایک گرداب!''

''ہم اس ملک کو دوبارہ تعمیر کر دیں گے اور کوشش کریں گے کہ بھول جائیں......''

''کس کی دوبارہ تعمیر؟ بغیر روح اور بغیر رحم کا ایک شہر؟ نئے بنک اور نئے غریب محلے؟ تم دوبارہ پانی کو، کھیتوں کو، گلیوں کو اور لوگوں کے ذہنوں کو ناپاک کرنا شروع کر دو گے۔ تم چاہتے ہو کہ میں زندہ رہوں؟ کیا کرنے کے لئے؟ کہاں رہنے کے لئے؟''

''اگر تم اپنے جسم کی پرواہ نہیں کرتیں تو کم از کم اپنی روح کے بارے میں سوچو۔''

''تمھیں یہ دعویٰ کرنے کا حق کس نے دیا کہ تم روحوں کو بچا سکتے ہو؟ تم جب نفرت کا

بیج بوتے ہو تو ایک نا قابلِ معافی ثمر کا بیج بوتے ہو۔ نہیں! تم نے یسوع مسیح کی بھی تحریف کی ہے۔ تم نے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں طالب علموں کو اپنی مرضی پر چلاتے ہوئے، ہر گھنٹا انھیں ذلیل کر کے زنٹہ بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے دوبارہ اثبات کے لئے انھوں نے صرف قتل و غارت کو ہی واحد راستہ جانا۔ تمھارے اثر سے فرار کے لئے، بغیر اس بات کو جانے ہوئے، وہ تمھارا گندہ کام کرتے رہے ہیں۔"

"تم اس احیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں جو ان کا منتظر ہے۔ ہم نے اس جنگ کو سیاست نہیں بلکہ خدا کے نشان تلے رکھا ہے۔ اس صدی میں کوئی جنگ ایسی نہیں ہوئی جس میں اتنے مقدس نشانات سینوں پر ہوں، مریم اتنی رائفلوں پر، صلیبی تصویریں اتنے ٹینکوں پر، خدا کا نام اتنے ہونٹوں پر، جنت کا تصور اتنی آنکھوں کے سامنے ہو، جیسا کہ ہمارے نوجوان کر رہے ہیں۔ یہ قدم بڑھاتے ہوئے ولیوں کی فوج ہے، جو اس انسانیت کے گناہوں کے عوض اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے ہیں جس نے یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھانا کبھی بند نہیں کیا۔"

"ہاں تم نے انھیں بے حس کر دیا ہے۔ وہ خود کو گناہوں کی سزائیں دے کر سرفراز سمجھتے ہیں اور جہنم کی خوفناک کہانیاں سن کر اپنے بچپن گزارتے ہیں۔ تمھارے اسکولوں میں جہاں پسینے اور لوبان کی خوشبو ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھوں میں تسبیح لیے ہوئے قتل کرتے ہیں اور لاشیں مسخ کرتے ہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ مریم کی خدمت کر رہے ہیں اور تم چاہتے ہو کہ میں ایک ایسے واہمے کے آگے سر جھکاؤں؟"

"تمھاری روح ڈوبنے والی ہے میری روز! تم، جس کے نام میں مریم اور اس کی علامت دونوں شامل ہیں، ہر خاندان کی باتیں ایک لمبے عرصے تک کرے گا اور بغیر کسی رحم کے۔"

"میں بتاتی ہوں یہ خاندان کیا ہیں! سخت پٹھے، مقفل دیگیں جن میں شر پکتا ہے، ظلم

کے تہہ خانے۔ وہ بھی تمہارے شکار ہیں۔ تم نے انہیں سکھایا کہ مثالی خاندان ایک بیٹے اور ایک ماں پر مشتمل ہوتا ہے جو عرب عورت کی طرح اپنے بیٹے کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کرتی۔''

''یہ بکواس ہے میری روز! تم بے ادب اور بدچلن ہو۔ تم اپنی دیوانگی میں غرق ہو۔ ہاں یارب! تیری مرضی ہو کے رہے گی۔ میں نے ایک تیرے اپنے کو واپس لانے کی کوشش کی اور اس نے مزاحمت کی۔ وہ چیخیں جو اَب میں سن رہا ہوں اس سزا کا اشارہ ہیں جو تو نے آسمان سے بھیجی ہے۔ یہ نوجوان تیری پروردگاری کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔ وہ فرش پر سوائے اپنی جگہ سے سرکے ہوئے اعضا کے ڈھیر کے جو گناہگاروں کا تھا، کچھ نہیں چھوڑتے۔ نہ میں اسے کوئی آشیرباد دے سکتا ہوں نہ دعائے خیر۔ اس کا اب کوئی چہرہ نہیں ہے۔ وہ تیرے فیصلے کے سامنے گر گئی ہے۔ وہ تیری ذمے داری ہے۔ وہ اب ہماری نہیں ہوگی۔ ہم اس زمین پر تیرے اور تیرے عزیز بیٹے کے مفادات کے محافظ ہیں تاکہ تیری رضا پوری ہوتی رہے، اس زمین پر جیسا کہ آسمان میں ہوتی ہے اور عظیم راہ کی کنجی صرف تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ آمین!''

۷

میں اس روشنی کی بات کرنا چاہتی ہوں۔ ایک قتل ہمیشہ بہت دیر تک چلتا رہتا ہے۔ میں یہ بات ابد تک کہتے رہنا چاہتی ہوں کہ سمندر خوبصورت ہے۔ اور بھی زیادہ، کیونکہ اس خون نے جسے لالچی بارش بہا کر لے گئی، سمندر میں سرخ سڑکیں سی کھول دیں۔ صرف اس میں، اس کی ناقابلِ فراموش نیلاہٹ میں، سب کا خون بالاخر یکجا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جسموں کو جدا کیا، انھوں نے ذہنوں کو جدا کیا۔ وہ جو حکومت کرتے ہیں اور وہ غیر ملکی بھی جنھیں مغرب کی ہوا لے کر آئی ہے۔ وہ ایران اور سوویت روس سے آئے ہوئے، سب نے اپنی مریضانہ دورخی بچگانہ منطق کے ساتھ ان دیہاتی ذہنیتوں میں زہریلی جڑی بوٹیاں بوئی ہیں، ان اکھڑے ہوئے دماغوں میں، ان مفلس علاقوں کے بچوں میں۔ انھوں نے ایسا اس لئے کیا ہے تا کہ آبادی جو ایک ہی وقت میں سینکڑوں راستوں پر بڑھ رہی تھی، اپنا راستہ کھو دے اور ہر متحرک وجود کو ایک ہدف یا موت کا یقینی خطرہ بنا دے۔ پاگل پن ایک طوفانی آندھی کی طرح ہے اور اس کی حرکت ایک دائرے کی صورت میں ہے۔ یہ گول گول گھومتی جاتی ہے اور اس ملک میں جو ایک بند اکھاڑے کے سوا کچھ نہیں رہا اور اس شہر میں جو ایک

بڑے سیمنٹ کے مربعے کے سوا کچھ نہیں رہا، آگ کے دائرے بناتی جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے گرد اپنی کھوکھلی دلیلوں کے دائرے بناتے ہیں، ان کی خستہ دیواریں، ان کی نفرت، ان کے اندھے پن کی طرح کھوکھلی دلیلیں...... وہ ایک دوسرے کو صرف توپوں، مشین گنوں، تلواروں اور چھریوں سے مخاطب کرتے ہیں اور سمندر ان کے بے تحاشا سڑے ہوئے جسموں کو وصول کرکے عدم سے ان کا ملاپ کر دیتا ہے۔

ایک پھانسی کے روز روشنی کیسی ہوتی ہے؟ ایک معمولی روشنی۔ یہ صرف ہمارے دماغ میں ہوتا ہے کہ بجلی کے بلب گھومتے ہیں اور دن کی حرارت پھٹ پڑتی ہے۔ یہ ہمارے دماغ میں جو فطرت کو منور کرتے اور بدلتے ہیں۔ چونکہ ابھی تک وہ مشینوں کی لمحاتی آزادی کے ساتھ کام کرتے ہیں، اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ کیسے اپنی کھڑکیوں کے پیچھے، اپنی دیوار کے ٹکڑے کے پیچھے لوگ زندہ ہیں۔ اکیلی عورتیں، عورتیں اور مرد، اکیلے مرد وغیرہ وغیرہ۔ جانور کیوں نہیں آجاتے اور ان مکانوں کو کرائے پر لے لیتے یا مریخ کے، چاند کے یا خلا کے لوگوں کی آمدورفت کیوں نہیں ہوتی؟ اس پامال سرزمین کی ایک نئی زندگی؟ ہر شے اتنی معمول پر کیوں ہے؟

میں جب حق پر ہوتی ہوں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔ میرے ہاتھوں کا درجۂ حرارت مجھے یہ بتانے کے لئے بڑھ جاتا ہے۔ میرے جسم میں کوئی شے لرزتی ہے۔ میرے اطراف میں ہر شے خاموش ہو جاتی ہے اور میں اسے دیکھتی ہوں۔ خاموشی ایک طرح کا حلقۂ نور بناتی ہے۔ میرا سر ایک خالی، غیر مرتعش آبی جلد بن جاتا ہے جس کی اندرونی سطح بالکل صاف اور کھنچی ہوئی ہوتی ہے۔ ہر شے منجمد ہو جاتی ہے۔ ہلکی سی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ خلا میں گھومتی زمین سے نکلتی آواز کی طرح! میں صحیح ہوں، کتنی صحیح ہوں میں! پھر میں پرواز کا آغاز کرتی ہوں، یہ یقین رکھتے ہوئے کہ میں واقعی پنجرے سے آزاد ہوں۔ لیکن ایک سچ کو دریافت کرنا ایک بنیادی حد کو دریافت کرنا ہے، ذہن میں ایک قسم کی اندرونی دیوار کو پہچاننا ہوتا ہے،

چنانچہ میں گزرتے وقت کی زمین پر دوبارہ گر جاتی ہوں اور دریافت کرتی ہوں کہ یہ میری روز ہے جو صحیح ہے۔

یہ ضرور کہنا چاہیے، ضرور! تاکہ یہ تہذیب جس نے وقت کی رات میں جنم لیا ور اب نیوکلیئر دیوار کے سامنے بدحواس ہے، اس نئی قوت کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے ہے، وہ سب کچھ سن لے جو اس کے لوگ اسے بتانا چاہتے ہیں، تاکہ یہ آخری پہاڑ کی پیمائش کر سکے۔ ان مریضوں کی طرح جو نقلی خون و خوراک سے زندہ رکھے گئے ہیں، عرب دنیا ایک آپریشن کی میز پر پڑی ہے۔ آلات کو ہٹا دینا چاہیے۔ سانس کے آلے کو پلگ سے نکال لینا چاہیے۔ مریض کو تھوکنے پر مجبور کرنا چاہیے، بلغم نہیں بلکہ بنیادی بیماری، اس کے گلے میں اٹکا ہوا خون نہیں بلکہ الفاظ، الفاظ کی دلدل جو ایک مدت سے وہاں انتظار کر رہی ہے۔

انھیں دیکھو! یہ چار مرد جو اس دم توڑتے پرندے پر بیٹھے ہیں، جو اس پر قالینوں کے انداز سے، سوداگروں کے قدیم اور بوجھل اشاروں کے ساتھ، جھکتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عورت ایک قابلِ قدر شکار، ایک گراں بہا مالِ غنیمت اور ایک کمال کی گرفتاری تھی۔ اگرچہ وہ اسے ایک عجائب گھر کے قابل شے خیال نہیں کرتے۔ وہ ایک عورت تھی، ایک بے وقوف عورت، دشمنوں سے ملی ہوئی اور سیاست میں گھسی ہوئی جو کہ مناسب طور پر ان کا ذاتی شکار کا علاقہ ہے۔ شباب کو عورتوں کو ایک نظام میں واپس لانا پڑا۔ اس مشرق میں جو بیک وقت خانہ بدوش اور غیر متحرک ہے۔ فلسطینی طرف بھی انھوں نے اسی طرح جرائم کے فیصلے کیے۔ خطرے مختلف تھے لیکن طریقے ایک جیسے تھے۔

اس نے ان کی علمداری میں آنے کی جرأت کی۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس نے گیدڑ کی اس جبلت کو جو اس مرغیوں کے انتظار میں بٹھائے رکھتی ہے، نظر انداز کیا، وہ جبلت جو اَب تک خلیج سے بحرِ اوقیانوس تک رہنے والے لوگوں کی کھالوں کے نیچے موجود ہے۔ قبیلے کے بہادر جوان شکار کرتے ہیں اور شکار کو واپس باڑے میں لے کر آتے ہیں۔ یہ ایک مشترکہ

بھلائی ہے۔ چاہے جنوبی تیونس کے مسلمان قبیلوں میں ہو یا لبنانی پہاڑوں کے عیسائی قبیلوں میں۔ جال میں پھنسا ہوا ہرن سب کا مشترکہ مال ہوتا ہے۔ کنکریٹ کے مکانوں میں یا سیاہ خیموں کے نیچے وہ حملہ آوروں کی واپسی کا باز کی آنکھوں اور پنجوں کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ ہر روز وہ سرد مہری کے ساتھ جال پھیلاتے ہیں اور اس شکار کو پکڑتے ہیں اور اپنے عظیم کاموں کی لمبی فہرست میں ایک اور شکار کے نام کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

وہ ایک اور بڑے گمان میں بھی مبتلا تھی، اس یقین میں کہ عورتیں مظالم سے محفوظ ہیں اور رہنما سیاسی لڑائیوں کو خالصتاً مردوں کی جنگ تصور کرتے ہیں۔ درحقیقت عورتوں کی کچھ قوتوں تک بہتر رسائی کی وجہ سے انھوں نے انھیں زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھنا شروع کیا، اور شاید زیادہ دشمنی کے ساتھ۔ ہر نسوانی عمل، حتیٰ کہ مختیرانہ اور بظاہر غیر سیاسی بھی، اس دنیا میں ایک بغاوت خیال کیے جاتے تھے جہاں عورتوں نے ہمیشہ غلامانہ کردار انجام دیے ہیں۔ میری روز اپنی گرفتاری کے بدنصیب دن سے بہت پہلے سے ان کے اندر نفرت وحقارت کے شعلے بھڑکا رہی تھی۔

بہر حال، اذیت کا خوف اکثر اس کے ذہن میں آتا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بتایا تھا کہ اگر اس نے چند خاص خفیہ جماعتوں میں شمولیت سے انکار کیا تھا تو وہ صرف قید کے خوف کی وجہ سے تھا۔ لیکن وہ ایک گہرے ایمان کے ساتھ تحریک کا ساتھ دیتی تھی اس لئے کہ یہ سیاست سے زیادہ محبت کا اور تمام عربوں کی زندگی اور موت کا سوال نظر آتا تھا۔

اسے یقین تھا کہ یہ نصب العین سب کے لئے لازماً مقدس ہے اور جب اسے ریاکاری کا شبہ ہوتا تھا تو وہ اپنی بے اعتمادی کو دبا دیتی تھی۔

جسمانی ایذا اس کے ذہن پر چھائی ہوتی تھی کیونکہ وہ اس میں یا اس شخص میں جو اس کی مزاحمت کرتا تھا، انسانی بہادری کی انتہا دیکھتی تھی۔ اسے جسمانی تکلیف سے نفرت تھی۔ شدید نفرت۔ اور وہ اسے فطرت کے خلاف ایک بنیادی ناانصافی خیال کرتی تھی۔ اس نے

خود کو یقین دلایا ہوا تھا کہ لوگ اخلاقی اور جسمانی بیماریوں سے شفا پا سکتے ہیں اگر صرف اگر صرف ...... کبھی کبھار وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتی کہ ایذا رسانی کا کوئی وجود نہیں جبکہ اسے معلوم تھا کہ دنیا کے ہر دار الحکومت میں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایک دوپہر ایک دوست کے گھر بالکنی سے شہر کے واحد عام باغ کا نظارہ کرتے ہوئے، جسے وہ بچپن میں بڑا باغ کہتی تھی، اس کی ملاقات ایک بلجیم کے صحافی سے ہوئی جو ویت نام سے اپنے گھر جاتے ہوئے بیروت سے گزر رہا تھا۔ وہ ویت کانگ کے ہاتھوں سائیگون کے قریب پکڑا گیا تھا اور آخر کار کئی دن کے بعد اپنی شناخت کو ثابت کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ وہ خوفزدہ تو نہیں تھا اور اس نے کہا کہ بے شک وہ خوفزدہ تھا۔ وہ مستقل ویت نام میں خوف زدہ تھا۔ اس نے اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ اگر اسے قید کیا گیا تو وہ اپنی زبان نگل جائے گا اور اپنا دم گھونٹنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ اگر بات زیادہ بگڑ گئی اور فرار کا کوئی راستہ نہ مل سکا تو وہ اپنے جرح کرنے والوں کے ساتھ ایسی زبردست گستاخیاں کرے گا کہ وہ اپنا کام تیز تر کر دیں۔

یہ گفتگو اکثر اگلے چند برسوں میں اس کے ذہن میں آتی رہی جبکہ بغداد، عمان، دمشق اور یروشلم میں ڈراؤنے خوابوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ان کے شہروں کے قید خانوں کے قریب سڑکوں پر سیاسی قیدیوں کی چیخیں سنی جا سکتی تھیں۔ کم از کم میری روز نے (اور بہت سے دوسروں نے) اپنے آپ سے کہا کہ لبنان کے لوگ ان حکومتوں تلے رہتے ہیں جو بے ایمان ہیں مگر پھر بھی "اچھے لوگوں" سے بنی ہیں۔ کوئی شخص یہ تسلیم کرتا نظر نہیں آتا تھا کہ ظلم ایک اخلاقی سرطان کا حصہ تھا جو سارے مشرقِ وسطیٰ میں پھیل رہا تھا۔

اس طرح یہ ہوا کہ بیروت ایک بہت بڑا کھلا زخم بن گیا۔ اگر تکلیف کی پیمائش اونسوں اور مربع سینٹی میٹروں میں کی جا سکتی تو اس شہر کی تکلیف اس صدی میں سارے دوسرے

شہروں سے بڑی تھی۔ میڈرڈ، برلن، سائیگون، ایتھنز، ان میں سے کسی نے وہ قتل وغارت اور اذیت پسندی نہیں دیکھی جو اس شہر نے دیکھی۔ اس طرح گولیوں، راکٹوں، نیپام اور فاسفورس بموں کے دھواں دھار تیزاب کے غسل میں، سیاسی قتل اور اغوا کے ساتھ ہر شخص اپنی ذاتی اور فیصلہ کن قیامت سے دوچار ہوا۔ ایک بظاہر پرسکون آسمان میں اڑتے ہوئے اکیلے پرندے کی طرح، میری روز کو مہم پر نکلے ہوئے شکاریوں نے مار گرایا۔

کسی کو بھی جمال عبدالناصر کی بنائی ہوئی ہم مرکز دائروں کی مشہور تصویر یاد ہوگی۔ پہلے مصر، پھر اسلامی تیسری دنیا، پھر باقی تیسری دنیا...... لیکن عرب تاریخ کے اس ہیرو کی ظلم کے ہم مرکز دائروں کی سخت تنقید اور انھیں توڑنے کا کام اپنے ذمے لینا چاہیے تھا۔

مرکز میں فرد ہے، اپنے خاندان کے دائرے میں گھرا ہوا، پھر ریاست کا دائرہ آتا ہے، پھر برادر عرب ممالک کا، پھر دشمن کا دائرہ، عظیم طاقتوں کا اور اسی طرح اور آگے...... یہ ظلم کے دائرے ناگزیر طور پر دھوکوں کے دائرے ہیں۔ ان کی اندرونی جگہوں میں زندگی کی قوتوں کو کچلا جاتا ہے، نیست و نابود کیا جاتا ہے اور ایک ظاہری بے نظمی کو ایک مہلک نظم و ضبط کے ذریعے برقرار رکھا جاتا ہے۔

طاقت ہمیشہ فحش ہوتی ہے۔ صرف حیات کو موٹا کر کے ہی دماغ انسان کے لئے ''طاقت'' حاصل کرتا ہے اور اسے برقرار رکھتا ہے اور تمام طاقت آخر کار اپنا اظہار سزائے موت میں کرتی ہے۔ میری روز بلڈوزر کے راستے میں گھاس کی پتی تھی اور فلسطینی بھی، اسی عالمگیر طاقت کے کارندوں کا کام سنبھالتے شامی بلڈوزر آتے ہیں۔ مشرق سے بحیرہ روم تک ٹینک حیات کو کچلنے کا کام جاری رکھنے آتے ہیں۔ ظلم کے دائرے تشدد کے دائرے بھی بن جاتے ہیں۔ میری روز اپنی موت میں اکیلی نہیں ہے۔ ہر سیکنڈ اس شہر کے باشندے جو اس کے ساتھی تھے، ڈھیر ہو رہے ہیں۔ جہاں ٹینک رکتے ہیں، وہاں ہوائی جہاز ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ہوائی جہاز عرب دنیا کی مکھیاں بن گئے ہیں۔ انھوں نے طاقت کے جنون

میں جنم لیا اور وہ طاعون جو وہ ساتھ لے کر چلتے ہیں، دنیائے عرب کے تازہ عذاب کا بار بردار ہے۔

کلاس روم میں اپنی حواس باختہ کر دینے والی سادہ لوحی میں ڈوبا منصفین کا گروہ بیٹھا ہے، منیر، ٹونی، فواد اور بونا لیاس۔ ان کے سامنے میری روز ہے، بجھے ہوئے بلب کے نیچے ایک رسی سے لٹکی ہوئی اور گونگے بہرے بچے ہیں۔ دیوار پر ایک صلیب کی تصویر ہے لیکن اس کمرے میں یسوع ایک قبائلی شہزادہ ہے۔ وہ تباہی کے علاوہ کہیں نہیں لے جاتا۔ اسے ان حالات میں آواز دینا درست نہیں ہوسکتا، کیونکہ سچا یسوع تو صرف اس وقت وجود رکھتا ہے جب کوئی اجنبی سچ کا دفاع کرنے کے لئے اپنے بھائیوں کے آگے تن کر کھڑا ہو۔ صرف اس وقت یسوع معصومیت کا حامل ہوتا ہے۔

آپ اسے پسند کریں یا نہیں، پھانسی ہمیشہ ایک جشن ہوتی ہے۔ یہ علامتوں کا رقص ہے جنھیں موت استحکام بخشتی ہے۔ یہ بے عفو خاموشی کی تیز پرواز ہے۔ یہ ہمارے درمیان مکمل تاریکی کا دھماکا ہے۔ اس سیاہ ضیافت میں سوائے رقص کے کوئی کیا کرسکتا ہے؟

گونگے بہرے بچے اٹھتے ہیں اور گرتے ہوئے بموں کی لے پر جو تھرتھراتی زمین سے ان کے جسموں تک آتی ہے، وہ رقص شروع کر دیتے ہیں۔